گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما
کشف المحجوب
اور
اکیسویں صدی
مرکز تجلیات

# کشف المحجوب
# اور
# اکیسویں صدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم




نام کتاب: ______ کشف المحجوب اور اکیسویں صدی

تصنیف: ______ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین عازم بیگ قادری

تاریخ اشاعت: ______ صفر المظفر 1438ھ | نومبر 2016ء

کمپوزنگ: ______ فیصل ایوب قادری

صفحات: ______ 48

ناشر: ______ جیلانی اینڈ کمپنی

تعداد: ______ 1100

قیمت: ______ -/70 روپے


**پبلشر**

جیلانی اینڈ کمپنی

زیر مسلم مسجد بیرون لوہاری گیٹ لاہور

موبائل نمبر: 0324-4007011

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

# تعارف مصنف

محمد امین عازم بیگ قادری یکم جنوری 1959ء کو چیچہ وطنی میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے انگریزی، عربی وایل ایل بی کیا اور بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ایم اے اسلامیات کیا۔ 2010ء میں پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ 1984ء سے تاحال محکمہ تعلیم میں انگریزی کے پرفیسر کی حیثیت سے فرائضِ منصبی سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں نہ صرف اُردو اور انگریزی ادب سے بلکہ فارسی وعربی ادب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور تصوّف کا بھی عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اسی محبت میں پی ایچ ڈی کیلئے اُن کا موضوعِ انتخاب ''صوفی ادب'' تھا۔ مصنف کا شعری مجموعہ ''اے غوث مرے'' جو کہ زیرِ طبع ہے، میں انہوں نے زندگی کے معاشرتی، سیاسی، اخلاقی اور علمی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

اوائل عمر میں قدوۃ الاولیاء حضرت سید محمد انور جیلانی رضی اللہ عنہ، جو کہ سلسلۂ قادریہ فاضلیہ کے جلیل القدر اولیاء میں سے ہیں، کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ جبکہ اگست ۲۰۰۸ء میں پیکرِ حلم ولطافت حضرت پیرزادہ علی محمد صابری مدّ ظلُّہ نے انہیں سلسلۂ عالیہ قادریہ منوریہ، چشتیہ صابریہ، چشتیہ نظامیہ، نقشبندیہ، اور سہروردیہ میں خلافت واجازت سے نوازا۔ اسی طرح سے ۲۰۱۰ء میں سیدِ عالی برکات خواجہ غلام دستگیر شاہ قادری فاضلی دام برکاتہ نے انہیں قادریہ فاضلیہ کے علاوہ متعدد سلاسلِ طریقت میں خلافت واجازت سے مشرف فرمایا۔

محمد عارف ہاشمی قادری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام ادیانِ عالم میں سے اسلام وہ واحد دین ہے۔جس نے اپنے عین وقت وُرُود پر شعوری طور پر اپنی کلّیت، اکمال اور اتمام کا ابدی دعویٰ کیا۔ارشاد ہوا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

''آج میں نے آپ کے لیے آپ کے دین کو درجہ کمال تک پہنچا دیا اور آپ پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور آپ کے لیے اسلام کو بطور دین پسند فرمالیا۔''[1]

اور سیّد الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثتِ عظیمہ کی سرمدیّتِ قاطعہ کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

''اور ہم نے آپکو بلا تخصیص سب لوگوں کی طرف بشارت ونذارت کے لیے بھیجا''[2]

پھر اس آفاقیتِ لایزال کی توجیہ وحکمت اور تایید وتقویت یوں فرمائی:

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

''اور ہم نے آپکو ہی تمام جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا''[3]

اس ہمہ گیریت کا دعویٰ محض ہوا و تجوّف پر نہیں بلکہ انسان و کائنات کے مابین موجود ربطِ فعال کی، جو کہ رونق وتحریکِ حیات ہے، ٹھوس اور امر بنیاد پر کیا گیا اور ہر ذی شعور اور ذہنی طور پر مستقیم الزاویہ انسان پر واضح کر دیا کہ:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

''کوئی ایسا خشک و تر نہیں ہے جو اس بیان کر دینے والی کتاب میں نہیں ہے۔''[4]

اتمامِ حجت کی اس قطعیتِ باہرہ اور کلیّتِ ظاہرہ پر رسالتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دینِ حیاتِ کائنات کے دیگر تمام ادیان و اہلِ عوالم پر حقِ تام کی وضاحت فرما دی کہ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

''اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ کو ہدایت اور دینِ حق اس لیے دے کر بھیجا کہ اسے ہر دوسرے دین پر غالب کر دے''[5]

غلبۂ دینِ اسلام کو غلبۂ الٰہی قرار دینے کی متعدد حکمتیں اور وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک جامع حکمت و وجہ یہ ہے کہ اسلام وہ دینِ حیات ہے جو امور و معاملاتِ ظاہر و باطن کی تہذیب و تدبیر ایسے اوامر و نواہیِ مترتبہ کے ذریعے سے کرتا ہے کہ انسان کے ظاہری اور باطنی روابط کا ظہور ایسے عملی نظام کی صورت میں ہوتا ہے کہ انسان اور کائنات، فرد اور معاشرہ، قوم اور اقوام کے مابین باہمی رشتوں میں حیات آفرین و حسن آماج توازن قائم ہو جاتا ہے، اور یہی وہ توازن ہے جو انفرادی و اجتماعی، معاشرتی و معاشی، عمرانی و سیاسی، قومی و بین الاقوامی، ظاہری و باطنی، سائنسی و ماورائی سطحوں پر تسلسلِ حیات اور انبثاقِ زندگی کا کفیل ہے، جس سے تخلیق کو قیام، تحریک کو دوام اور اقدارِ مثبتہ کو مقام ملتا ہے، اور انسانیت سنیت کی اس معراج پر پہنچ جاتی ہے جہاں وہ رسولِ انسانیت آماج صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کا مصداق بنتا ہے:

★اِذَا تَمَّ الْفَقْرُ فَهُوَ اللّٰهُ★[6]

''جب فقر کمال کو پہنچ گیا تو وہی اللہ ہے۔''

اسی مرتبہ علیا کی توضیح وتائید اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر مختلف انداز میں فرمائی۔[7]

مگر اس منہاج پر عامۃ النّاس کی تہذیب وتربیت کے اہم ترین اور دشوار ترین کام کو خلائے محض میں نہیں چھوڑا گیا بلکہ نبیِ صاحب المعراج ﷺ کے بعد اسے علمائے راسخین ''اہلِ ذکر'' کو تفویض کیا گیا۔لہٰذا حکم دیا گیا کہ:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

''سو اگر تمھیں علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھو''[8]

کیونکہ یہی اہلِ ذکر علماء ''وَرَثۃُ الأنبیاء''[9]، درجۂ نبوت سے ''اقرب''[10]، ''افضل النّاس''[11] اور صاحب ''العلم باللہ''[12] ہیں۔اور علم کی اسی سطحِ مرتفع پر رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا:

★عُلَماءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیاءِ بَنِیْ اِسْرائِیْل★

''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں''[13]

پھر اس اعزاز وتفخیم کے ساتھ ایک بشارتِ ابدی وحتمی سے بھی مشرف فرمایا کہ:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

''سنو! اللہ کے ان دوستوں کے لیے کوئی خوف اور غم نہیں ہے''[14]

دستارِ نیابتِ نبویہ سے آراستہ، تاجِ خلافتِ الٰہیہ سے پیراستہ، وسیع القلب، کشادہ آفاق اولیائے کرام کی یہ نورانی جماعت بامرِ ربّ العالمین:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

''اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے کہ بھلائی کی طرف بلائے

اور اچھی بات کا حکم دے اور بُری سے منع کرے“[15]

قلوبِ عالمیاں کے دبیز تہ دار ظلمت کدوں کو اسلام کے نورِ مُستنیر اور فیضانِ سراجِ منیر عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کی ترسیل کے لیے اقصائے عالم میں آفتابِ حیات بخش بن کر پھیل گئی اور خطہ ہائے ارضی کو اپنے نورِ فیضان سے منور کر دیا۔ برکاتِ عظیمہ کی امین یہ جماعت سلسلہ در سلسلہ آج تک مخلوقِ خدا کے دلوں کو قرآن و سنّت کے حقیقی فیض سے سیراب کر رہی ہے اور تا ابد اپنے اس کارِ خیرِ عظیم میں مشغول رہے گی۔

اس گروہِ قدسی کا فریضہ اولین تزکیہ نفس، تعلیمِ کتاب وحکمت اور تعلیمِ باطن ہے۔ اس لیے کہ جس مسندِ تبلیغ وارشاد پر انہیں متمکن کیا گیا وہ اسی بات کی متقاضی ہے کہ نائبینِ رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کی بدولت وہی عظیم کام انجام دیں جو خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دیتے رہے۔ صرف اسی صورت میں وہ اس اعزاز و تفخیم کے مستحق قرار پائیں گے جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمائی ہے۔ قرآنِ عظیم میں سرتاجِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصبِ عالی کی وضاحت میں ارشادِ ربانی ہے:

كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ﴿۱۵۱﴾

”جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان تمہیں میں سے ایک عظیم رسول بھیجا جو کہ تم پر ہماری آیتوں کو پڑھتا ہے، تمہیں پاک کرتا ہے، تمہیں کتاب وحکمت کا علم دیتا ہے اور وہ کچھ بھی تعلیم کرتا ہے جو تم ہرگز نہ جانتے تھے“[16]

قرآنِ مقدس کی مذکورہ بالا وضاحتِ متینہ کے مطابق حضور سیدِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصبِ جلیل مندرجہ ذیل پانچ فرائض کا متقاضی ہے:

① —— تلاوتِ آیاتِ الٰہیہ

② ـــــ تزکیۂ نفوس
③ ـــــ تعلیمِ کتاب
④ ـــــ تعلیمِ حکمت
⑤ ـــــ تعلیمِ غیر معلوم

یہ وہ فرائضِ خمسہ ہیں کہ جن کی بطریقِ احسن انجام دہی سے روحِ دینِ اسلام کو فروغ اور مقاصدِ اسلامیہ کو اوجِ تسلسل اور مقبولانِ بارگاہِ ایزدی کو ہمیشہ سے عروج حاصل رہا۔ حالات و واقعاتِ عالم کبھی بھی آغوشِ جمود میں آسودہ نہیں رہے بلکہ گہوارۂ تغیرات میں ہر عہد میں کروٹوں سے دوچار اور رخ بدل دینے والے طمانچوں کا شکار رہے۔ مگر اسلام کے ان ابطالِ حیات پرور نے مصافِ زندگی میں ایسے جواں ہمت تربیت یافتگان مہیا کیے جنہوں نے بصیرت افروز فتوت اور جلا بخش محبت سے ہر نو آمدہ مسئلے، ہر معمۂ حیات کو ایسے احسن طریق سے حل کیا کہ اسلامیانِ عالم تسخیرِ کائنات کی ان انتہاؤں کو پہنچے کہ عالمِ رنگ و بو ابھی تک ورطۂ حیرت میں گم اور جواب سے قاصر ہے۔ اسکا لازمی نتیجہ ایسی تہذیب و تمدن کی شکل میں نمودار ہوا کہ جس میں ظاہری اور باطنی طور پر اقدارِ حیات کا امتزاج ایسے مثبت انداز میں ہوا کہ انسانی رویوّں اور کائناتی تناظرات میں جذباتی تنوعات کے مابین حسنِ اعتدال قائم رہا۔ اس پاکیزہ و معتدل ماحول میں ایسی تخلیق انگیز فضا کو سیطرت حاصل ہوئی کہ ان نفوسِ قدسیہ نے انسانوں کی بھرپور رہنمائی اور دائمی ہدایت کے لیے اپنے نورانی شاہکاروں سے اہلِ علم کے قلوب کو منور رکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ اپنے فرائضِ خمسہ کی تاثیر کو اپنے عہد اور اپنے عہد سے ماوراء پہنچا ئیں۔ انہیں نورانی شاہکاروں میں سے ایک عہد ساز شاہکار **کشف المحجوب** ہے جسے اسلام کے بطلِ جلیل، عہد آفرین، شناورِ بحرِ معرفت، امام سید ابوالحسن جلاّبی علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے تخلیق فرمایا۔

یہ اس خاقانِ کشورِ عرفان وحقیقت، سلطانِ ملکِ ولایت، برہانِ علم وحکمت، مجاہدِ حق وطریقت، فرزندِ رسولِ انام علیہ اطیب الصلوٰت والتسلیمات کا اسمِ نور افشاں ہے کہ دامانِ لسان جس کی توصیف سے عاجز اور گفتار جس کی مدح وتعریف سے قاصر ہے اور کیوں نہ ہو! یہ وہ مردِ مومن ہے جس نے خطۂ برصغیر میں، جو کہ مردم خیزی میں سرتاجِ عالم ہے، اس وقت اسلام کا دیپک روشن کیا جب ہر طرف کفر وشرک، بت پرستی وصنم مستی، اور ہوس رانی و نیرنگِ نفسانی کی ظلمات دل کے ہر تار پر رقصاں اور ذہن کے ہر گوشہ پر حکمران تھیں۔ اس مردِ حیات آماج نے اس دیپک کو اس قرینے اور دوام سے روشن کیا کہ چراغ سے چراغ جلتا گیا یہاں تک کہ برصغیر پاک وہند نورِ اسلام سے آج تک اقوامِ عالم میں ستاروں کے درمیان چاند کی مانند جگمگا رہا ہے۔ داتا حضور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کا فیضانِ ہدایت نہ کبھی منقطع ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔ **كشف المحجوب** کے تندرست مطالعہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔ کہ سید علی ہجویری قدس سرہ نہایت ہی جاندار، بغایت قوی وتوانا اور انتہائی متحرک ومحرِّک شخصیت کے حامل تھے جو کہ استادِ قابل کی لیاقت، مرشدِ کامل کی صداقت، مردِ حقانی کی عدالت، عارفِ ربانی کی لطافت، ولیِ اکبر کی رصانت، دُرویشِ ابہر کی وجاہت، عترتِ رسول عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کی شرافت، دامانِ بتول عَلَیْہَا السَّلَامُ کی نجابت اور حیدرِ کرّار عَلَیْہِ السَّلَامُ کی فتوت و بطولت سے مرکب تھی۔ ان کے پختہ استدلال کے مقابل فلسفی کی موشگافیاں اور کلامی کی دقّت شناسیاں سب ہیچ۔ طوفانِ پیچاں اور طغیانِ سرگرداں **كشف المحجوب** کے ایک حباب سے ترساں۔ اور حق یہ ہے کہ داتا حضور رضی اللہ عنہ سے قبل یا ان کے بعد شانِ تصوف کے حامل کسی بھی صدرِ نورانی سے ایسی تحریر کا انشراح نہ ہوا جسے **كشف المحجوب** پر بدیہی تفوق حاصل ہو۔

خزینۂ علم وعرفان **كشف المحجوب** کی تخلیق آج سے تقریباً نو سو سال پہلے

ہوئی۔مگر یہ ایسے ہمہ گیر اصولوں اور آفاقی قواعد پر مبنی ہے کہ آج جب کہ انسان متموّج صدیوں کو عبور کرتا ہوا سحر انگیز اکیسویں صدی عیسوی اور طلسم داماں پندرھویں صدی ہجری کے گرداب ہائے غلطاں میں داخل ہو چکا ہے، اس کی اہمیت پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ بنیادی وجہ وہ تقلّباتِ زمانی ہیں جن سے تغیراتِ مکانی وقوع پذیر ہوئے؛ جن کی نحوست سے دنیائے اسلام معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ملّی ادبار اور نتیجتاً جغرافیائی تقسیمات اور اندرونی و بیرونی انقلابات سے نبرد آزما ہوئی۔ قواتِ کفر و شرک شروع سے ہی سلطنتِ اسلامیہ میں کشاکش و خلفشار پیدا کرنے کیلئے سرگرمِ عمل رہیں۔ مگر اسلامیانِ عالم کبھی بھی مراکزِ رشد و ہدایت ''خانقاہانِ مردانِ حق'' سے دور نہ ہوئے۔ لہٰذا ایمان سے قلوب معمور اور گرمیِ دین سے ذہن مسحور رہے۔ مجالسِ اولیائے کرام نے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوت دلوں میں جگائے رکھی اور اس کے تحت مسلمانانِ عالم کامیابی کے ساتھ مقاصدِ اسلامیہ کے حصول میں زندہ تگ و دو میں مصروفِ عمل رہے۔ اس عالم میں پوری دنیا پر ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک قوتِ عظمیٰ (Super power) کے طور پر حکمران رہے؛ بست و کشادِ جہان کے مالک اور سلطانِ حل و عقدِ عالم کے بختاور رہے؛ ان کی سیطرت ہر اقلیم پر مسلط اور ان کی حکومت ہر ذی روح کو مسلّم رہی۔ دنیا امن و امان کا گہوارہ، اوج و ترقیِ انسانی کا مسکن، حریت و آزادی کا ایوان اور صنعت و حرفت کا استھان تھی۔ اللہ اور اس کے رسولِ اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشائے اعلیٰ سے طوعاً و کرہاً سب مغلوب تھے۔

اس اوج و ترقی کے ساتھ عالمِ اسلام کی صفوفِ تنظیم میں مخالف عناصر بھی کارگر رہے۔ جس کی وجہ سے امتِ اسلامیہ اندرونی و بیرونی کشاکش سے دوچار رہی۔ کئی فرقہ ہائے ضالّہ نے جنم لیا جو باعثِ تزلزل ہوئے، حکمرانوں کا تساہل، عوام کا تغافل اور باہمی تنافر کئی گل کھلاتا رہا۔ وحدتِ ملّت کا شیرازہ کئی مرتبہ بکھرنے کو آیا، مگر خانقاہ نے اپنا مثبت

کردار ایسی حقیقت شناسی کے ساتھ ادا کیا کہ شیرازہ بندی کا تسلسل ٹوٹنے نہ پایا۔ مگر اٹھارویں صدی عیسوی اور بارھویں صدی ہجری کے ابتدائی عشرات میں کفر و شرک کی قوتوں نے ایک نئی، توانا اور جاندار کروٹ لی۔ برطانیہ اس محرّک سازش و ریشہ دوانی کی آماج گاہ بنا، اس سازش کا نکتۂ محوری یہ ٹھہرا کہ اسلامیانِ عالم کے درمیان ایسے موثر علمائے سُوء تلاش کئے جائیں جو عوام الناس کو بنامِ شرک خانقاہوں اور مزاراتِ اولیاء سے دور کریں تا کہ دلوں سے آتشِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام، جو کہ اصلِ ایمان اور وجہِ فلاحِ اسلامیان ہے، فرو ہو۔ جس کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کے باہمی افتراق، نظریاتی آویزش اور مغلوبیت و عبودیت کی صورت میں برآمد ہوگا۔ حسبِ منشاو مقصود مسلمانوں کے اندر سے مطلوبہ متنفس تلاش کر لئے گئے[17] اور انہوں نے انگریز نگرانی کے تحت اس تنظیم سے کام کیا کہ اہل اسلام پر سقوط و زوال مسلّط ہو گیا۔ وحدتِ اسلامیہ کا شیرازہ چھوٹے چھوٹے غیر موثر جغرافیائی بخروں میں منتشر ہو گیا۔ مسلمانانِ عالم کو افلاس و ادبار اور اندرونی و بیرونی خلفشار نے محیط کر لیا اور یہ احاطہ آج تک اس لئے نہ ٹوٹ سکا کہ مخالفینِ اسلام کی تربیت یافتہ وہ فتنہ انگیز قوتیں بڑے منظم انداز میں سرگرمِ عمل ہیں۔ لہٰذا مسلمانانِ عالم انہیں حالات و اوضاع میں غلطان و پریشان اکیسویں صدی میں داخل ہوئے ہیں۔

ان اوضاع و احوال کی منجدھار میں نشأۃِ اسلامیہ کیلئے انتہائی اہم ہے کہ:

**اولاً:** مراکزِ علم و عرفان اور محاورِ رشد و ہدایت کی طرف جذبہ و آہنگِ نو کے ساتھ رجوع کیا جائے اور قلوب کو اُسی شمعِ عشقِ رسول ﷺ سے منور کیا جائے جو صحتِ عقائدِ دینیہ اور عینِ ایمان ہے۔

**ثانیاً:** گذشتہ دو صدیوں کے دوران میں عالمِ جدید جن قومی اور بین الاقوامی تقلبّاتِ زمانی اور تغیراتِ مکانی، سائنسی اور ٹیکنالوجیکل انقلابات اور ان سے پیدا شدہ اثرات اور حالات و واقعات سے گزرا اور گزر رہا ہے۔ ان کا

معاشرتی و معاشی، انفرادی و اجتماعی، عمرانی و سیاسی اور قومی و بین الاقوامی تناظرات میں حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے۔

**ثالثاً:** اس حقیقت پسندانہ جائزے میں تحسینات و تقبیحات اور ترجیحات و تردیدات کا معیار قرآن و سنت اور آثارِ علمائے راسخین اہلِ ذکر کو بنایا جائے۔

**رابعاً:** بوقتِ معیار سازی وسیع مشربی کا رویہ اپنایا جائے اور نظریاتی تعصّبات، گروہی اشتعالات، اور تقسیم کار عصبیات کو خیر باد کہہ کر وحدتِ ملت کا علم بلند کیا جائے۔

**خامساً:** وحدتِ ملت کے اس علم کو لہراتے ہوئے اکنافِ عالم میں پھیلایا جائے تاکہ چشمہ ہائے رشد و ہدایت کی سیرابی عام ہو اور بین الاقوامی سطح پر امن و سلامتی، اخوت و مروت اور حریت و آزادی کی فضا میں وحدتِ انسانی انجام پائے۔

ان پانچ بنیادی قواعد کے زیرِ فکر اقوامِ عالم کے مخمول گوشوں سے نقاب کشائی ہوگی اور موجود و معدوم کی آگہی بھی حاصل ہوگی اور یہی وہ آگہی ہے جسے فراستِ مومن سے تعبیر کیا گیا۔[18] اس مقصد کے حصول کیلئے قرآن و سنت اور ان کے حقیقی ترجمان آثارِ اولیائے کرام رضوان اللہ علیہم کا مطالعہ اور اجتہادی بصیرت کے ساتھ ان کی فہم و تفہیم ہمارا اولین فریضہ ہے۔ اس لئے کہ فسادِ تشعیب کی اصلاح کیلئے جب تک جمع کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا ازالۂ تفرقہ اور تنظیم کی صورت پیدا نہ ہوگی۔ کیونکہ تشعیب فعلِ انسانی اور جمع فعلِ الٰہی ہے اور جب تک فعلِ انسانی فعلِ الٰہی کے حکم و قابو میں نہ ہوگا ترتیب و تہذیب اور تحسین و تمکین سے معرّیٰ رہے گا، بایں وجہ فساد در فساد پھیلتا جائے گا۔

یہ محض نظریاتی یا فلسفیانہ موشگافی نہیں ہے بلکہ اقوامِ عالم پر سیطرتِ اسلامیہ کے ہزار سال اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ گزشتہ پچیس سالوں سے سیطرتِ مغرب کا شیرازہ جس طرح خود بخود بکھرنا شروع ہوا ہے اور تمام شعبہ ہائے حیات تنزل آمادہ ہو چکے ہیں۔

حالانکہ مغربی سیطرت کو ابھی بمشکل سو سال ہوئے ہیں اس سے بھی اسی امر کی گواہی ملتی ہے کہ فعلِ انسانی صرف اور صرف فعلِ الٰہی کے ماتحت ہی مستقیم و مقیم ہوتا ہے۔ مغربی سیطرت کی وجہ بذاتہٖ حرمانِ جمع اور دنیائے اسلام کا مخصوص حالات میں من حیث القوم جمع سے مکمل محرومی تھی۔ جب تشعیب وجمع کے مابین اجتماعی طور پر افتراق و بعد واقع ہو گیا تو داعیانِ مادّہ تشعیبِ مقیم کے باوجود غالب آ گئے کیونکہ عالمِ اسلام کو عادتِ مادّہ نہ تھی۔ اور اب اگر سیطرتِ مغرب کا طلسم ٹوٹنا شروع ہوا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ عالمِ اسلام نے جمع کی طرف رجوع کیا ہے بلکہ اس سبب سے کہ محض مادہ پر استوار تشعیب کے اپنے اندر معاشرتی و معاشی، سیاسی و اجتماعی اور قومی و بین الاقوامی برائیاں موجود تھیں اور اس پر صدیوں میں سمیٹے ہوئے اسلامی اثرات و اقدار کا معظم حصہ جب زائل ہو گیا اور مغرب اپنی خالص حیوانیت میں نمودار ٹھہرا تو مختلف شعبہ ہائے حیات میں رچی بسی برائیوں کا، جو کہ ان کی اصل تھیں، تصادم ہو گیا۔ جس کی بناء پر مغربی سیطرت کا شیرازہ خود سے خود بکھرنے لگا۔ مغربی تہذیب و تمدن اور غلبہ و سلطان مادہ کے ایوانوں سے اٹھے؛ یہیں پر ٹھہرے رہے؛ اور یہیں سے سقوط آمادہ ہوئے اور یہی ان کا حتمی مقدر تھا۔ اور ہر اس تہذیب و تمدن اور غلبہ و سلطان کا مقدر ہوتا ہے جو استقامتِ فعلِ الٰہی سے عاری ہو۔

تاریخِ سیطرتِ مغرب کے عمیق دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ مطالعہ سے یہ بات اجاگر ہوتی ہے کہ مغربی معاشرہ اپنی اصل کے اعتبار سے رجعت پسندانہ حیوانی معاشرہ تھا۔ جب اسے سیطرت حاصل ہوئی تو اس نے چار مخصوص حیوانی رویوں کو رواج دیا:

① ارہابیّت: (Terrorism)

② استعماریّت: (Imperialism)

③ استبدادیّت: (Tyrannical despotism)

④ تشددیّت: (Violence-mania)

ان عواملِ اربعہ کی آغوش میں جو مغربی تہذیب وتمدن پروان چڑھی، اس کا قوام و حشت وبربریت، فساد وخونریزی، اضطراب وبے صبری، متنوع اسلحہ سازی کی توفیر، جوہری اسلحہ کی توسیع وتکثیر، ترہیب وتعصب، جنسیت پرستی، نفسانیت شعاری اور ریاستی ارہاب وانکار سے تیار ورائج ہوا۔ اس کالازمی نتیجہ بین الاقوامی سطح پر معاشرتی، معاشی اور سیاسی افراتفری، عالمگیر بے چینی، دیگر ممالک اور اقوام کے حقِ خود ارادیت اور اقتدارِ اعلیٰ کے استحقاق کی پامالی اور ان کا ہمہ رنگ استحصال، ملکی بین الاقوامی سرحدوں کا عدم احترام، اپنے مقاصدِ مذمومہ کیلئے اقوامِ متحدہ کے اداروں کا استعمال اور انفرادی واجتماعی امن و سلامتی کیلئے گوناگوں خطرات کی شکل میں نکلا۔ دو عظیم جنگیں، ایک ہی خمیر سے مرکب دو بڑی عالمی قوتوں (Super Powers) کی باہمی کشاکش اور ان کے درمیان پسنے والے ممالک اور بایں وجہ دنیا بھر میں ادبار وافلاس اور پسماندگی ومفلوک الحالی کا دور دورہ، بین الاقوامی سطح پر اسلحہ سازی کی بدترین دوڑ، ویت نام، افغانستان اور عراق پر خود غرضانہ عصبیت زدہ، متحدہ خون آشام ارہابی امریکی یلغاریں اور اس کے ردعمل میں پیدا شدہ موجودہ عالمی مناظر اس تلخ حقیقت پر دال ہیں۔ اقبال نے سچ کہا:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی[19]

مغربی تہذیب وتمدن کا ایک دوسرا پہلو سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کے اوج کا نمائندہ ہے اور اس حقیقت سے انکار محض باعثِ پسماندگی ہوگا۔ اس لئے کہ جب مغرب کی بے خدا تہذیب نکتۂ عروج کی طرف مائل ہونا شروع ہوئی مسلمان سائنسدان نظریاتی کام پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے تھے اور تجرباتی دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر مسلم تنزل اور مغربی سیطرت کے بعد لامحالہ تجرباتی کام مغربی سائنسدانوں نے ہی پایۂ انجام کو پہنچایا۔ یہ مغربی سائنسدان وہی تھے جن کی تربیت مسلم سائنسدانوں کے ہاتھوں اور مسلم تہذیب کے تحت ہوئی تھی۔ مغربی سیطرت کے ساتھ مسلم سائنسی شاہکاروں کو مغرب میں منتقل کرلیا

گیا؛ مسلمانوں کی متابعت میں تجربہ گاہیں قائم ہوئیں؛ اور سائنسی ترقی تجرباتی راہ پر گامزن ہوئی۔ مگر اس ترقی میں صرف مغربی سائنسدانوں کا حصہ نہیں بلکہ یہ دنیا بھر کے سائنسدانوں کے عملی کردار کا نتیجہ ہے۔ ہاں البتہ اس ترقی کے ثمرات سے استفادہ سب سے بڑھ کر کرنے والا صرف مغرب ہے۔ مگر اس پہلو کا سب سے بڑا المیّہ یہ رہا ہے کہ مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کا بھی اپنے مقاصدِ سیطرائی کیلئے دہشت انگیزانہ اور استحصالیانہ استعمال کیا۔ جس کی بناء پر کمزور اقوام پر عرصۂ حیات تنگ سے تنگ تر ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گردی اور ارہابیت عالمی تمدن کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے اور امریکہ اس کے فعّال نمائندہ اور ترجمانِ اکبر کی واضح ترین صورت میں اقوامِ عالم کے سامنے ہے۔

ان اوضاع وحالات کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے اقوامِ عالم کو بالعموم اور ملتِ اسلامیہ کو بالخصوص ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنا ہوگی جس سے عالمی سطح پر فساد کا ازالہ ہو، امن وامان کا دور دورہ ہو اور سائنس وٹیکنالوجی کے ثمرات سے سب تاحدِ امکان یکساں طور پر استفادہ کر سکیں۔ اور رفعِ فساد اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسان تشعیب سے جمع کی طرف نہیں آتا۔ بالفاظِ دیگر جب تک تشعیب جمع کے ماتحت رہتے ہوئے میدانِ حیات میں عمل پیرا نہ ہوگی فلاحِ انسانی کی کلّی اور حتمی صورت پیدا نہ ہوگی۔ قرآن وسنت اور آثارِ اولیائے کرام چونکہ قطعی طور پر جمع کے علمبردار ہیں صرف انہیں کا فکر انگیز اور مجتہدانہ مطالعہ وتعمیل جدید انسان کو نجات وفلاح سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں آثارِ اولیائے کرام رضی اللہ عنہم میں سے **کشف المحجوب** اکیسویں صدی کے انسان کیلئے سب سے بڑھ کر مفید ومُمد اور یاور ومددگار ہے۔ یہ اس لئے کہ **کشف المحجوب** کا تعلق عملی زندگی سے براہِ راست ہے؛ جمع کو تشعیب پر جاری وساری کرنے سے متعلق ان آداب وسُبُل کی سیاحی کا عملی نصاب روشن ضمیر انسانِ حاضر کے

سامنے رکھتی ہے کہ جن پر عمل پیرا ہو کر ہر شعبۂ حیاتِ تازہ میں تکمیلِ انسانی کے زریں مراحل کو طے اور مقاصد و مراماتِ نوشگفتہ کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مسائلِ نو واردہ کی جس چکی میں آج کا انسان پس رہا ہے **کشف المحجوب** انکے حل کیلئے برہانی اشارات اور نورانی اقدامات تجویز کرتی ہے۔

موجودہ مسائل کا صحت مندانہ جائزہ لینے کیلئے ضروری ہے کہ موجودہ آبادیاتی اور معاشی حالات پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے۔ اس لیے کہ آج عالمِ انسانیت شدید آبادیاتی بحران کا شکار ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ آبادی میں تیزی سے ہوتا ہوا اضافہ اور اس کی وجہ سے زرعی زمین پر بارِ اقامت سے پیدا شدہ مسائل، دیہات سے شہر، پھر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف نقلِ مکانی کا رجحان اور معاشرتی عدم استحکام، پھر اس کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی کے ذریعے سے پیداواری اضافہ اور روایتی پیشوں کی اِزاحت سے درپیش مسائل ہیں۔[20] ان حالات میں انسانی معاشرے کو سب سے اہم درپیش امتحان یہ ہے کہ کس طرح سے قوتِ آبادی کے تقاضوں کو قوتِ فنیات (Power of technology) سے پورا کیا جائے جب کہ مراکزِ فنیات کے مالک ممالک اور انفجارِ سکانی (Population explosion) کے شکار ممالک کے درمیان آبادیاتی انفصال واقع ہے۔ انفجارِ فنیات (Techonology explosion) ان معاشروں میں وقوع پذیر ہو رہا ہے جو معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں اور جہاں آبادی میں اضافہ کی شرح بہت کم ہے۔ مگر انفجارِ سکانی کا شکار وہ علاقے ہوئے ہیں جہاں فنیاتی ذرائع محدود ہیں، سائنسدانوں اور تربیت یافتہ کارگزاروں کا فقدان ہے اور تحقیق و ترقی پر ہونے والے اخراجات ناکافی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں فنیاتی انقلاب کو نظریاتی، مذہبی اور معاشرتی بنیاد پر قبول کرنے کی صلاحیت بھی نسبتاً کم ہے[21]۔ ان مزاحمتوں میں فنیاتی اعتبار سے ترقی یافتہ اقوام کی طرف سے پسماندہ اقوام کو فنیاتی سہولتوں کی عدم منتقلی،

ترقی یافتہ ممالک میں غیر ملکی متلاشیانِ روزگار کیخلاف قائم کردہ گونا گوں امتیازات[22] اوراس بناپر امنڈنے والی سیاسی ومعاشرتی کشاکشوں اورعدم توازن نے مزید اضافہ کردیا ہے۔اکیسویں صدی میں حیاتیاتی فنیاتی انقلاب (Biotechnological Revolution) سے سیاسی ومعاشرتی،عمرانی ومعاشی اورقومی وبین الاقوامی سطح پران مسائل میں مزید شدت اوراضافے کی قوی گنجائش نظر آرہی ہے[23]؛اوران کے اثرات کے ماتحت دنیا بھرمیں متنوع تبدیلیاں متوقع ہیں،یہاں تک کہ بذاتِ خودقومی ریاست کی سلامتی کوشدید خطرات لاحق ہونے کاامکان ہے۔[24] کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی تعمیم اورجدید ابلاغیات کے زیر اثر پہلے ہی کئی مقامات پرمختلف تہذیبیں اورتمدن خلط ملط ہو چکے ہیں اورمذکورہ بالا حالات میں اگرقومی وبین الاقومی سطح پرہوشمندی اورفراست کا مظاہرہ نہ کیا گیاتواس تہذیبی تصادم میں جس پرہنٹنگٹن (Huntington) نے طویل بحث کی ہے[25] کسی تحت الحیوانی تہذیب کی فتح کاازسرِنواندیشہ ہے۔

ان معروضی حالات وواقعات کی جلومیں وہ ظروفِ غیرمعروضی بھی ہیں جودرحقیقت ان معروضی حالات وواقعات کوقابومیں رکھا کرتے ہیں؛ان میں نفسیاتی ونفسانی اورجنسی و ہم جنسی معمات شامل ہیں کہ جن پرجب قوتِ مادہ کاتسلط قائم ہوچکاتومغرب میں تحت الحیوانی معاشروں نے تشکیل پائی حتیٰ کہ دورِجہالت کے معاشرے بھی مغربی معاشروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ انسانی دکھائی دیتے ہیں۔المیہ یہ ہے کہ ان تحت الحیوانی معاشروں میں جن غیرانسانی ذہنی رویوں کوسیطرت حاصل ہے وہی رویے جدید ابلاغیات کے ذریعے سے دیگر،بالخصوص مسلم،ممالک کے انسانی معاشروں تک ترسیل پارہے ہیں اوروہاں پرموجودصحت مندتنقید کے باوجودسرایت کرتے جارہے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ مادی تہذیب کی چکاچوند،عوامی جہالت،مناسب ذہنی تربیت کافقدان،اورحکومتی سطح پر انسانی تہذیب وتمدن پرغیرانسانی منفی رویوں کے اثرات کی روک تھام کیلئے عدم کوشش اور

عدم دلچسپی اور ان انسانی معاشروں میں صحت مند، مثبت اور فعال قیادت کا قحط ہے۔ موجودہ صدی میں اگر ان غیر انسانی رویوں کے اثرات کا قومی و بین الاقوامی سطح پر سدِ باب نہ کیا گیا تو جدید انسانیت پر حیوانیت کے بند دریچے مسلط ہو جائیں گے، مجموعی طور پر انسانی تہذیب وتمدن کا تصور ختم ہو جائیگا اور مغرب کی طرح پورا انسانی معاشرہ رجعت وتقہقُر کی بدترین مثال بن جائیگا۔ اس تخلُّف وتراجع سے نجات کی صحت مندانہ طور پر صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ فعلِ الٰہی کی سیطرت کو دل وجان سے غیر متعصبانہ طور پر قبول کر لیا جائے۔ اس مقصد کیلئے قومی معاشروں میں سیطرتِ شریعتِ اسلامیہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے تاکہ بین الاقوامی معاشرہ انسانی اقدار اور بقا کا حامل ہو۔ اس مقصد کیلئے اسے فعال اور مضبوط قیادتِ اسلامیہ کی ضرورت ہے۔ اکیسویں صدی میں انسانی معاشرہ کی اصلاح کیلئے کینیڈی (Kennedy) نے جن تین بنیادی عناصر...... تعلیم، مقام عورت، اور سیاسی قیادت کی ضرورت . . پر زور دیا ہے[26] انہیں صرف مذکورہ بالا اہم ترین وضاحتوں کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کی احتیاج صرف مادیت نہیں ہے بلکہ بذاتِ خود انسانیت ہے۔ بالالفاظِ دیگر انسانی معاشرہ میں مادیت صرف اس رنگ میں قابلِ قبول ہوگی کہ وہ مقتضائے انسانیت کے ماتحت اور اس سے ہم آہنگ رہے۔

اکیسویں صدی کے تناظر میں اتفاقِ ہمہ جہت کی اس سطح سے جب ہم **کشف المحجوب** کو پرکھتے ہیں تو یہ کتاب ہمارے سامنے بطور ایک رہنمائے کامل کی حیثیت میں ابھرتی ہے۔ اس لیے کہ اسے ایک اکمل صاحبِ طریقت، ولیِّ کامل، مرشدِ مکمل حضور داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ نے تصنیف فرمایا ہے؛ اور دستِ طریقت ہمیشہ نبضِ حیات پر ہوتا ہے جو اس کی ہر دھڑکن اور ہر پھڑک کی گیرائی اور گہرائی کو کتاب وسنت کے مقیاسِ حقیقی سے ماپتا ہے اور طرح طرح سے اسے محبت وآشتی کی خوراک دے کر فعلِ الٰہی سے مربوط کرتا ہے؛ کیونکہ طریقت اوامر ونواہی کے بدرجہٗ احسان، انفرادی واجتماعی

سطح پر، اس نفاذ کا نام ہے کہ اعتبار و منتہائے شریعت کا، بتوحیدِ ظاہر و باطن، حصول ہو۔ اور اعتبارِ شریعت ''اَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّه یَرَاکَ''[27] اور منتہائے شریعت ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلاَّ لِیَعْبُدُوْنِ'' ہے۔[28] اور اعتبار و منتہائے شریعت کے حصول کیلئے علم حاصل کرنا اولین فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت کی متابعت میں تمام اولیائے حق نے حصولِ تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے مگر داتا حضور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ کا تخصص یہ ہے کہ رغبتِ تعلیم دلاتے وقت انکا اسلوب نہایت لوچدار اور برہانی ہے۔ **کشف المحجوب** میں پہلا باب ہی علم پر باندھتے ہیں اور آغاز میں ہی بغایت عملیت پسندی اور حقیقت شناسی سے یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ ہر قسم کا علم حاصل کرنا انسان پر فرض نہیں ہے بلکہ صرف وہ علم جو مقاصدِ شریعت کے حصول کیلئے ضروری ہے۔ اور حضرت داتا رضی اللہ عنہ کی نگہِ رسا میں شریعت معاملاتِ حیات کی، قرآن وسنت کے مطابق، بجا آوری ہے یہی وجہ ہے کہ جب شریعت کے حوالے سے علم کی تعیین فرمائی تو قرآنی حوالے سے علم کی دو (۲) قسمیں بتلائیں:

❶ علم مضرت رساں ❷ علم مفید

وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَایَضُرُّهُمْ وَلَایَنْفَعُهُمْ

''وہ ایسا علم حاصل کرتے ہیں جو انہیں نقصان دیتا ہے اور فائدہ نہیں دیتا''

اور پھر اس پر حدیث پاک سے مہر ثابت کر دی:

★اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ★

''میں اس علم سے جو نفع نہ دے تیری پناہ مانگتا ہوں''

گویا ہر وہ علم جو معاملاتِ حیات سے نبرد آزما ہونے کیلئے ضروری ہے نافع ہے اور ہر علمِ نافع عین منشائے شریعت ہے۔ اس کے برعکس جو علم انسانیت کیلئے ضرر کا باعث ہے

غیر نافع ہے لہٰذا عین خلافِ منشائے شریعتِ اسلامیہ ہے۔ غیر نافع علم کا حصول ممنوع اور علمِ نافع کا حصول فرضِ عین ہے۔ اور اس بات کی قطعی وضاحت سید علی ہجویری قدس سرہٗ نے مروجہ علوم میں سے چند کے نام لے کر بطور مثال کے فرما دی ہے:

چون علم نجوم و طب و علم حساب و صنعتہای بدیع و آنچہ بدین ماند

''مثلاً علم نجوم و طب اور حساب اور دیگر نئی صنعتوں کا علم اور جو اس کی مثال دوسرے علوم ہوں۔''[29]

اس جملے میں ''صنعتہائے بدیع'' کی ترکیب بڑی جامع اور کمالِ اہمیت کی حامل ہے۔ فارسی لغت میں ''بدیع'' کا معنی ہے: تازہ، نو، شگفت/موجد و مبتدع[30] اور ''صنعت'' کا معنی ہے: پیشہ، ہنر، کار[31] پوری ترکیب کا معنی ہوگا تازہ بہ تازہ پیشے اور کام، جسے ہم آج فنیات (Technology) کہتے ہیں۔ اور جملے کے اگلے حصے ''و آنچہ بدین ماند'' سے ہر قسم کی فنیات کے، جو کہ مقاصدِ شریعت کے حصول کیلئے وقت کی ضرورت ہیں، اکتساب کو فریضہ قرار دیا۔ پھر اسی بات کی مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

و فریضہ بر بندہ علمِ وقت باشد و آنچہ بر موجب وقت بکار آید ظاہر و باطن[32]

''اور بندے پر اپنے وقت علم اور ہر اس شے کے علم کا حصول فرض ہے جو ظاہر و باطن میں وقت پر کام آئے''

یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ داتا حضور رضی اللہ عنہ نے لفظِ ''وقت'' کا استعمال صوفیائے کرام کی مخصوص اصطلاح میں نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اولاً علم باللہ کا تعلق کسب سے نہیں، عطا سے ہے؛ اور عطا فرض نہیں ہوا کرتی۔ ثانیاً فقرے کے آخر میں ''ظاہر و باطن'' کی قید بھی لگائی گئی ہے۔ پھر اسی کے مطابق علم کو دو اقسامِ جلی، اصول و فروع، میں تقسیم کیا

گیا؛ اسی اصول وفروع کو مزید دو دو حصوں میں منقسم کیا؛ ظاہرِ اصول کو قولِ شہادت اور باطنِ اصول کو معرفت، جبکہ ظاہرِ فروع کو ''برزشِ معاملت'' یعنی امورِ حیات کو بطریقِ شریعتِ اسلامیہ متواتر انجام دینا اور باطنِ فروع کو ''تصحیح نیت'' (نیت کو درست رکھنا) سے تعبیر کیا گیا اور نہایت ژرف نگاہی سے ظاہر و باطن کو بیک دیگر اس طرح سے لازم وملزوم قرار دیا کہ ایک کے بغیر دوسرا بے مقصود ٹھہرا۔ ملاحظہ فرمائیے:

قیامِ ہر یک از این، بی دیگر محال باشد ظاہرِ حقیقت، بی باطن نفاق، و باطن حقیقت بی ظاہر زندقہ، ظاہر شریعت بی باطن نفس و باطن بی ظاہر ہوس۔

''ان میں سے ایک کا دوسرے کے بغیر قیام ناممکن ہے باطن کے بغیر حقیقت کا ظاہر منافقت اور ظاہر کے بغیر حقیقت کا باطن کفرو بے دینی ہے اسی طرح باطن کے بغیر شریعت کا ظاہر نفس اور ظاہر کے بغیر باطنِ شریعت ہوس ہے۔''[32]

دقتِ نظر سے اگر غور کیا جائے تو علم کی یہ تقسیم عملی اعتبار سے بغایت حقیقت پسندانہ ہے۔ اس سے اگلا اہم ترین قدم یہ ہے کہ حاصل کردہ علم کو اگر زیورِ عمل سے آراستہ نہ کیا جائے تو علم بذاتِ خود بے معنویت اور بے مقصدیت کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داتا حضور رضی اللہ عنہ علم سے بڑھ کر عمل کی تاکید فرماتے ہیں:

از علمِ اندک عملِ بسیار توان گرفت و باید کہ علم مقرونِ عمل باشد

''تھوڑے سے علم سے زیادہ عمل کی تحریک حاصل کی جاسکتی ہے لہٰذا چاہیے کہ علم عمل سے الگ نہ ہو''[33]

کیونکہ عمل کے بغیر علم، علم ہی نہیں ہے؛ اور اسی طرح علم کے بغیر عمل بھی عمل نہیں ہوتا۔[34] انہیں خطوط پر جب **''بابِ اثباتِ علم''** کا مطالعہ کیا جائے گا تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ داتا حضور رضی اللہ عنہ کے نزدیک انسان کی اپنی پہچان کا زینہ اولین علم ہی ہے؛ اسی کے ذریعے سے اسے کائنات اور خالقِ کائنات کے ساتھ اپنے رشتوں سے روشناسی ہوتی ہے۔ پھر اسی علم پر عمل کے وسیلے سے ان کائناتی روابط اور رشتۂ الٰہی کو پا کر وہ موجودات کا فعال رکن بن جاتا ہے اور وجودِ قائم بالذات سے قربتِ سرمدی کی اس معراج کو پالیتا ہے جہاں فعلِ بندہ فعلِ الٰہی کے زیرِ اقتدار نہیں بلکہ فعلِ بندہ فعلِ الٰہی ہو جاتا ہے اور یہی منتہائے شریعت ہے۔

مسلمانوں کے زوال اور مغرب کے عروج، اور اب پھر مغرب کے زوال، میں یہی راز مضمر ہے کہ مسلمان جہالت اور بدعملی کا شکار ہوئے، ان کے ظاہر و باطن میں افتراق واقع ہوا تو مغرب کو عروج ہوا کیونکہ ظاہرِ مغرب ظاہرِ مسلم سے اقوی تھا۔ اور مغرب چونکہ بے باطن تھا ظاہرِ مغرب کو سمت نما سہارا نہ ملا تو وہ خود سے خود شکست و ریخت کا شکار ہونا شروع ہوگیا۔ اس کی مفصل بحث گزر چکی ہے۔ آج ان حالاتِ دگرگوں میں انسان خصوصاً مردِ مسلم کو مردِ حق داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ کی واضح ترین تلقین یہ ہے کہ دین کی تنگ نظرانہ تعبیر نہ کی جائے، کیونکہ امورِ شریعت کی انجام دہی اور مقاصدِ شریعت (جو کہ حقیقتاً مقاصدِ انسانی ہیں) کے حصول کیلئے تمام مروجہ علوم کو حاصل کیا جائے۔ اکیسویں صدی ٹیکنالوجی، بائیوٹیکنالوجی، سائنس، کمپیوٹر اور جوہر کا دور ہے۔ یہ حکمتِ الٰہی کی امارات اور ظاہرِ شریعت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ لہٰذا یہ جہاں کہیں سے اور جیسے بھی ملیں ان کا حصول عین فرض ہے اور پھر انہیں قرآن و سنت کے منشا کے مطابق استعمال میں لایا جائے تاکہ معمورۂ حیات ایک فعاّل قیادت کے ماتحت امن و سلامتی کا گہوارہ بنے۔ جب معاشرہ امن و سلامتی سے شگفتہ ہوگا تو مرد و زن کے مابین تعلقات بھی متوازن

ہو جائیں گے اور اسے وہ معزز و مقدس مقام مل جائے گا جو شریعتِ مطہرہ نے عطا کیا ہے۔

علم کی درست توجیہہ اور ظاہر کو باطن کے زیرِ حکم رکھنے کیلئے اسلام نے تطہیرِ نفس کا بہت عمدہ فعال نظام ترتیب دیا ہے۔ بشریت کو درجۂ انسانیت پھر انسانیت کو انسانیتِ کاملہ تک پہچانے کیلئے بشر کو درجۂ بشریت پر اور انسان کو درجۂ انسانیت پر مخالفتِ نفس کا درس دیا گیا ہے۔ کیونکہ نفس وہ قوتِ امارہ ہے جو فعلِ انسانی کو فعلِ انسانی پر منحصر کر کے اپنی ذات کے محور سے متجاوزانہ پھیلاتی اور اسی محور کی طرف متجاوزانہ سمیٹتی ہے۔ اس ضمن میں جو مزاحمت بھی حائل ہو، اسے ہر ممکنہ طریقے سے دور کر کے خونِ دیگراں سے قصرِ خود استراحتی تعمیر کرتی ہے۔ لہٰذا کسی شخص کے اندر اس قوت کی فعالیت اسے کبر و تکبر، خود بینی و خود پرستی اور بے حسی و بے ادبی کے آتشیں لباس سے پیراستہ کر دیتی ہے۔ اور جب ایسے اشخاص معاشرتی، معاشی، سیاسی، قومی یا بین الاقوامی سطح پر ترابط و تعامل کے میدان میں اترتے ہیں تو خونریز مسابقت، ہلاکت آمیز مبارات اور بد اندیش اتحادات و اختلافات کی ترویج و اشاعت اور تشکیل و تعمیل کرتے ہیں جس کے باعث ہر سطح پر افراتفری، نراج، ارہابیت، دہشت گردی اور فساد و تشدد کی تعمیم ہوتی ہے اور امن و امان اور سکون و سلامتی کی تقلیل۔ مثبت اقدار پر مبنی تہذیب و تمدن کے قبرستان اور منفی اقدار کے حامل تہذیب و تمدن کے نخلستان بشریت کے ریگستان میں بچھ جاتے ہیں۔ ایسے میں آدمی تشعیب سے مکمل وابستہ اور جمع سے مکمل گستہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر نفس کو ''منبعِ شر'' اور ''مخالفتِ نفس'' کو تمام عبادتوں کا راز اور سب مجاہدوں کا کمال کہا گیا ہے۔[35]

تاریخِ عالم پر محض ایک طائرانہ نظر ہی اس حقیقت کا انکشاف کر دیتی ہے کہ جب نفس سوارِ بشر ہوا تو جبر و تشدد، آمریت، بربریت، فرعونیت، اسکندریت و یونانیت، یزیدیت و بُشیّت، عریانی و فحاشی، حیوانیت و جنس پرستی اور مغربیت و ہوا پرستی کو سیطرت حاصل ہوئی؛ اور جب انسان سوارِ نفس ہوا تو ذوالقرنینیت و سلیمانیت، موسویت و داؤدیت، محمدیت و

انسانیت، صدیقیت و عمریت، علویت و حسینیت، غوث الاعظمیت و مجددیت، غزنویت و اورنگزیبی، محبت و دوستی، اور امن و امان کو سلطان حاصل ہوا۔ بیسویں صدی میں سائنسی ایجادات اور فنیاتی معرکہ آرائیوں نے نفس و ہوا کو بے مثال انداز میں تحریک مہیا کی ہے۔ اور اسی ساز و سامان کے ہمراہ جدید انسان اکیسویں صدی میں داخل ہوا، اور اگر اب بھی انسان نے قصرِ نفس و ہوا کو ویران کرنے کی سعی بلیغ نہ کی تو اکیسویں صدی بھی خیر و برکت اور امن و سلامتی کی عطر بیزی سے محروم رہے گی۔ اس حرماں نصیبی کے تدارک کیلئے انتہائی اہم بات یہ ہے کہ سلطانِ جمع کے تحت تنظیمِ تشعیب کی جائے۔ امورِ حیات کی انجام دہی میں مخالفتِ نفس اور للّٰہیت کے رویوں سے اپنی کردار سازی کی جائے تاکہ مقاصدِ شریعت کا حصول اور انسانیت کو عروج ہو۔ اسی للّٰہیت کی وضاحت بغایت خوش اسلوبی سے حضرت داتا لاہوری رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یوں فرماتے ہیں:

> اغراضِ نفسانی اندر امور، آن بود کہ بندہ اندر کاری کہ می کند بجز خوشنودیِ خدای تعالیٰ باشد، و نجاتِ نفس از عقوبت طلب نکند
>
> ''امورِ حیات میں اغراضِ انسانی سے مراد یہ ہے کہ بندہ جو کام انجام دے اس میں رضائے الٰہی سے سعادت مند نہ ہو اور نفس سے نجات کیلئے تکلیف کا طالب نہ ہو''[36]

گویا ہر کام میں ہر سمت بندے کے سامنے اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کچھ نہ ہو۔ فعلِ بندہ تحریکِ ذاتِ بندہ سے نہ ہو بلکہ تحریکِ ذاتِ مولا سے ہو۔ اس وجہ سے فعلِ بندہ بے لگام نہ ہوگا اور مقاصدِ شریعت کی تحصیل ہو جائے گی۔ فعل انجام پذیر ہوگا۔ لیکن اگر اغراضِ نفسانی کے تحت آغاز ہوتا ہے تو ''رعوناتِ نفس را حدّی پیدا نباشد''[37] یہی انسانی تجربہ اور یہی تاریخی فیصلہ ہے۔

سیّدعلی ہجویری قدس سرہ نفسیاتی سلیقے سے توضیح فرماتے ہیں کہ نفس شناسی کیلئے خود شناسی یعنی حقیقتِ انسانیت کا علم ضروری ہے کیونکہ خود شناسی خداشناسی کی طرف رہنمائے ثابت ہے۔[38] اس کے بعد نفس، ہوا، شیطان، انسان اور رحمٰن تعالیٰ میں روابط وضوابط کا منطقیانہ اسلوب میں عملی، فلسفیانہ اور سائنسی تجزیہ بڑی کامیابی سے کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اس بات کو واضح فرماتے ہیں کہ گھٹیا اور کمینے اخلاق اور برے افعال کا سبب نفس ہے؛ اور ان کی دو قسمیں ہیں: اول معاصی؛ دوم اخلاقِ بد۔ دونوں شرع وعقل کے اعتبار سے غیر محمودہ ہیں؛ اور ان دونوں کا تدارک شرع وعقل کے معیارات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ریاضت سے کیا جا سکتا ہے۔[39] بعدازاں حقیقتِ انسانی کا تجزیہ نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان تین چیزوں سے مرکب ہے: اول روح، دوم نفس، اور سوم جسم۔ روح کی صفت عقل، نفس کی خواہش اور جسم کی صفت حس ہے اور خود انسان نمونۂ عالم ہے اور عالم دونوں جہانوں کو شامل ہے۔ انسان کے اندر ہر جہان کی امارات موجود ہیں۔ اِس جہان (دنیا) کی امارت ہوا، پانی، مٹی، اور آگ ہے؛ اور اُس جہان (عقبیٰ) کا نشان بہشت، دوزخ اور عرصات ہیں۔ بوجہِ لطافت روح کا مقام بہشت، بوجہِ آفت ووحشت نفس کی جگہ دوزخ اور جسم کا مقام عرصات ہے۔ اور ان دونوں معنی کا جمال قہرِ الٰہی اور موانستِ الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ لہٰذا رضائے الٰہی کی تاثیر بہشت اور غضبِ الٰہی کا نتیجہ دوزخ ہے۔ اسی طرح سے روحِ مومن معرفتِ الٰہیہ کی رحمتِ عنبرین سے متعلق ہے جبکہ اس کا نفس پردۂ گمراہی سے۔ لہٰذا بندہ جب تک دنیا میں نفس سے نجات حاصل کر کے درجۂ تحقیق تک نہیں پہنچتا قرب ومعرفت کی حقیقت سے محروم رہتا ہے۔ لہٰذا جو شخص دنیا میں اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے، ماسوا سے گریز پا اور شریعتِ مطہرہ پر عمل پیرا ہے، قیامت کے دن دوزخ اور پل صراط دیکھنے بھی نہ پائے گا۔ الغرض روحِ مومن دنیا میں بہشت کی طرف اسلئے بلاتی ہے کہ وہ اسی کا نمونہ ہے جبکہ

نفس دوزخ کی طرف بلاتا ہے کہ دنیا میں وہ اسی کا نمونہ ہے۔ امورِ روح کی تدبیر عقلِ تمام کرتی ہے اس لیئے اس میں درستی و راستی ہوتی ہے جبکہ نفس کی رہنمائی خواہشات کرتی ہیں اس لئے وہ نقص و خطا میں ڈوبا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالبانِ خدا ہمیشہ مخالفتِ نفس کو اپنا شعار بناتے ہیں تا کہ روح و عقل کی، جو کہ سرِ الٰہی کی جگہ ہے، معاونت کریں اور امورِ حیات درست سمت کے ساتھ انجام پائیں۔[40] مزید تھوڑا سا آگے چل کر ہوائے نفسانی کا بڑے مدبرانہ انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی امورِ انسانی میں مداخلتِ شیطانی کے نقطۂ آغاز کی نشاندہی کی ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے شیطان کو انسان کے دل و باطن میں مداخلت کی ہمت نہیں ہے کیونکہ شیطان ایک معروضی طاقت ہے۔ لیکن جب آدمی بازیچۂ نفس بن جاتا ہے اور ہوائے معصیت دل میں ظاہر ہوتی ہے تو اس وقت شیطان دل تک راہ پالیتا ہے۔ لہٰذا وہ اس ہوائے نفسانی کو آراستہ و پیراستہ کر کے دل کے سامنے پیش کرتا ہے اسی کو وسواس کہتے ہیں۔ ایسے میں شیطان امورِ انسان کی سمت بندی کرتا ہے یہاں تک کہ اسے ضلالت و گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے جہاں اس کا احساسِ انسانیت ختم ہو جاتا ہے فعلِ بشر فعلِ شیطان ہو جاتا ہے اور وہ مکمل طور پر اسیرِ شیطنت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ:

ترک ھوا بندہ را امیر کند وارتکابِ آں امیر را اسیر کند

''ترکِ خواہشاتِ نفسانی بندے کو امیر، اور ان کا ارتکاب امیر کو قیدی بنا دیتا ہے''[41]

جب شیطنت کی گرفت بندے پر قوی ہو جاتی ہے تو جسم کے اندر مقاماتِ ہوا و ہوس۔۔۔حواسِ خمسہ۔۔۔۔۔کو شہوت کی آگ اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور بندہ ہر معنی سے محجوب ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بندہ جب تک خود کو اللہ کے حوالے نہ کرے گا اسیری سے نجات ہوگی نہ محرومی کا اختتام ہوگا۔[42]

اس قیدِ شیطنت سے آزادی اور سعادتِ نعمت سے بہرہ یاب ہونے کیلئے اسلام نے تزکیۂ نفس کے نقطہ نگاہ سے اخلاقِ پاکیزہ اور آدابِ نیرہ کا ایک عملی نظام تشکیل دیا جس کی تعمیل ہمیشہ سے اولیائے کرام کرتے رہے ہیں اور عوام الناس کو اسی نظام کی تعلیم و تلقین کرتے آئے ہیں تا کہ مقاصدِ شریعت کے حصول سے قومی و بین الاقوامی سطح پر ایک فلاحی معاشرہ قیام پذیر ہو۔ اکیسویں صدی میں اس نظام پر عمل پیرا ہونے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تا کہ مغرب کے تحت الحیوانی معاشرے کے اثرات کا سدِ باب اور خود اس مغربی معاشرہ کی اصلاح اور مثبت انسانی اقدار پر مبنی تہذیب و تمدن کی ترویج ہو سکے۔ **کشف المحجوب** اس ضمن میں بہترین رہنما ہے کیونکہ تصوف میں جس نمائندہ طریقتِ علیا میں داتا حضور رضی اللہ عنہ کی تہذیب و تربیت ہوئی وہ آج تک عالمِ رنگ و بو میں اعلیٰ اخلاق اور آداب کی مبلغ رہی ہے۔ اور اس وجہ سے اس طریقت کے مشائخ و مریدین کی ایک الگ شان ہے۔ اس بات کا اندازہ داتا حضور رضی اللہ عنہ کے نزدیک عدم وفنا کے مفہوم سے لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> مرادِ عدم و فنا اندر عباراتِ این طائفہ سپری شدن آلتِ مذموم بود و صفتی ناستودہ اندر طلبِ صفتی محمود
>
> ''گروہِ اولیاء کی عبارات میں عدم اور فنا سے مراد برے اسباب و سامان سے دور ہونا اور ناپسندیدہ صفات کو پسندیدہ صفات اپنانے کی غرض سے ترک کرنا ہے۔''[43]

عدم وفنا کے مفہوم کی اتنی عمدہ اور عملی تشریح شاید ہی تصوف کی کسی کتاب میں ہو۔ اور یہی عملیت و حقیقت پسندی **کشف المحجوب** کا طرۂ امتیاز ہے۔ ''باب التصوف'' اس سلسلے کی ایک مخصوص کڑی ہے۔ داتا علی ہجویری رضی اللہ عنہ جب تصوف کا مفہوم و معنی

بیان کرتے ہیں تو کسی فلسفیانہ پیچیدہ سطح سے بات نہیں کرتے بلکہ حسبِ شریعت اعلیٰ اخلاق و آداب کو دل و جان سے اپنانے کا نام ہی تصوف بتلاتے ہیں۔ ایک جگہ پر سیدنا محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام کا تصوف کے ضمن میں قولِ زریں نقل فرماتے ہیں:

اَلتَّصَوُّفُ خُلُقٌ، مَنْ زَادَ عَلَیْکَ فِیْ الْخُلُقِ زَادَ عَلَیْکَ فِیْ التَّصَوُّفِ

''تصوف اچھی عادات و اطوار کا نام ہے۔ جو شخص عمدہ عادات و اطوار میں تجھ سے بڑھ کر ہے۔ وہ تصوف میں بھی تجھ سے بڑھ کر ہے۔''

پھر اس پر بغایت حقیقت شناسانہ معاشرتی تبصرہ کرتے ہوئے وضاحت فرماتے ہیں کہ اخلاق دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک ''خُلق با خَلق''، اور دوسرا ''خُلق با حق''۔ ''خُلق با حق'' کا معنی قضائے الٰہی پر مطمئن رہنا ہے، جبکہ ''خُلق با خَلق'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق کے ساتھ اچھے رہن سہن کا بوجھ اٹھایا جائے۔[44] بعد ازاں حضرت ابو حفص حداد نیسا پوری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ:

اَلتَّصَوُّفُ کُلُّہٗ آدَابٌ

''تصوف کل کا کل آداب ہے''[45]

اور پھر ساتھ ہی سیدنا مرتعش رضی اللہ عنہ کا مبارک قول کہ اَلتَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ ''تصوف حسنِ اخلاق کا نام ہے'' نقل کر کے بڑی ژرف نگاہی سے تمام ظاہری و باطنی اور معاشرتی و اجتماعی رویوں کو سمیٹتے ہوئے حسنِ اخلاق کو تین اہم ترین قسموں میں، کہ فرد کا کوئی رویہ جن سے بیرون نہیں جا سکتا، منقسم کر دیتے ہیں:

**اوّل: حسنِ خلق با حق:**

وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکامِ عالیہ کی بغیر کسی دکھاوے کے تعمیل کی جائے۔

**دوم: مخلوقِ خدا کے ساتھ حسنِ اخلاق:**

وہ یوں کہ بڑوں کے ادب واحترام، چھوٹوں پر مہربانی اور اپنے جیسوں کے ساتھ انصاف کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

**سوم:**

کسی معاملے میں بھی ہوا و ہوس اور شیطان کی پیروی نہ کی جائے۔

جس شخص میں یہ تینوں باتیں موجود ہوں وہ عمدہ عادات واطوار کا حامل کہلانے کا مستحق ہوگا۔[46]

پھر بہت آگے چل کر اپنے فکر و نظر کو انتہائی مربوط رکھتے ہوئے داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ اسی نہج پر آداب کی تقسیم بھی تین واضح رویوں میں کرتے ہیں:

① **ادب توحید باحق:**

بندہ خلوت وجلوت، مجلس وتنہائی میں بے ادبی کا ارتکاب نہ کرے۔ یعنی امورِ حیات یوں انجام دے گویا کسی بادشاہ کے عین سامنے کھڑا وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

② **معاملات میں اپنے آپ سے ادب:**

اپنے آپ سے ادب کا سلیقہ یہ ہے کہ تمام احوال میں اپنی ذات سے وابستہ مروت کی پاسبانی کرے یعنی وہ بات جو مخلوق اور اللہ کے سامنے بے ادبی ہو، اپنی خلوت میں بھی اس سے اجتناب کرے۔ مثلاً ہمیشہ سچ بولے، اپنی دانست کے خلاف بات نہ کرے کیونکہ یہ خلافِ مردانگی ہے۔ دوسرے یہ کہ کم کھائے تاکہ طہارت خانہ میں بہت کم جانا پڑے۔ تیسرے یہ کہ اپنی اس چیز (مثلاً ستر وغیرہ) پر خود بھی نظر نہ ڈالے جسے دیکھنا کسی غیر کے لیے نامناسب ہے۔

③ **رہن سہن میں ادب باخلق:**

آداب میں سے سب سے زیادہ اہم ادب یہی ہے۔ سفر اور قیام (مجلسی زندگی)

کے دوران میں مخلوق کے ساتھ رہن سہن میں کاروبار اور لین دین کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق انجام دے۔

آداب کے تینوں رویوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔[47]

پھر اس تحدیدِ آداب کے ساتھ ہی یہ بصیرت افروز وضاحت بھی کر دی گئی کہ حسبِ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ★حُسْنُ الْاَدَبِ مِنَ الْاِیْمَانِ★ ''حسنِ ادب ایمان کا حصہ ہے'' حسنِ ادب صاحبِ ایمان پر واجب ہے، اس لئے کہ تمام دینی و دنیاوی امور کی زیب و زینت آداب سے ہی قائم ہے، اور یہ حق ہے کہ کافر و مسلم سب کے نزدیک معاملاتِ حیات کی انجام دہی میں حسنِ آداب کو ملحوظِ خاطر رکھنا قابلِ تحسین ہے۔ لہٰذا دنیا میں کوئی ایسی رسم نہیں ہے جس کا قیام بغیر ادب کے ممکن ہو۔ پھر ان کی پہچان اور تعیین کرتے ہوئے داتا حضور رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آداب لوگوں کے درمیان کمالِ مردانگی کو ملحوظ رکھنے کا نام ہے؛ دینی اعتبار سے معاملاتِ حیات کی تنظیم و ادائیگی میں سنتِ رسولِ اعظم علیہ اکمل الصلوات والتسلیمات کے مطابق عمل کرنا آداب کہلاتا ہے؛ جبکہ محبت کے باب میں حفظِ حرمت کو ادب کہتے ہیں۔ تاہم یہ تینوں ایک دوسرے سے لاینفک ہیں کیونکہ جو شخص صاحبِ مروت (کمالِ مردانگی یعنی انسانیت والا) نہ ہوگا سنت کا اتباع نہ کریگا اور جو بھی پابندِ سنت نہ ہوگا وہ حفظِ حرمت بھی نہ کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ:

بہ ہیچ صفت تارک الادب ولی نباشد

''کسی بھی حال اور کسی بھی صورت میں ولی اللہ ادب نہیں چھوڑتا''

نفسیاتی اعتبار سے اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ادب چونکہ ولی اللہ کی عادت بن چکا ہوتا ہے اور عادت طبیعت کی ہمسر ہوتی ہے اور طبیعت کسی بھی حال میں پوری عمر حیوان سے زائل نہیں ہوتی اس لیے ولی اللہ، خواہ حالتِ سکر میں ہو یا حالتِ صحو میں، تارکِ ادب نہیں ہوتا۔ اسی عملی و حقیقی نقطۂ نگاہ کے تحت وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ غلبۂ محبت سے حکمِ

متابعت ساقط ہو جاتا ہے پرلے درجے کے گمراہ ہیں۔[48]

اکیسویں صدی کا انسان اگر اپنی عادات واطوار پر حقیقت پسندانہ انداز میں غور وفکر کرے تو اس پر عیاں ہو جائے گا کہ اپنے آباواجداد کے مقابلے میں وہ ادب سے کس قدر تہی دامن ہو چکا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے نائبین مردانِ حق کی توہین، مجالست ومعاملت اور مناظرت ومحاورت کے دوران میں حتیٰ کہ اسمبلیوں کے اندر عدم صبر وتحمل کا مظاہرہ، آئین وقانون کی، بغیر کسی ادنیٰ سی خلش کے، خلاف ورزی، محافلِ موسیقی میں پاپ سنگروں (Pop Singers) کا اچھلتے کودتے ہوئے جذبۂ جنسیت کو شعوری طور پر ابھارتے ہوئے گانا اور ان کے ساتھ حاضرینِ مجلس کا بے صبری کے ساتھ جوابًا رقص کناں ہونا.......... یہ سب باتیں ننگِ انسانیت ہیں؛ اور ان سے انفرادی واجتماعی، معاشی ومعاشرتی، سیاسی وقومی اور بین الاقوامی سطحوں پر جوار ہاب وتشدد، بیہودگی اور بے راہ روی اور دیگر برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں ان کا شکوہ اور ان پر حیف نمائی بھی جاری ہے۔ حیرت ہے کہ یہ نہ سوچا گیا کہ جب جڑوں کی آبیاری کی جائے گی تو پودے کیونکر نہ اگیں گے؟ ہمارے ہاں عجب غیر انسانی طریق اپنایا گیا ہے کہ برائیوں کے سوتے کھلے چھوڑ رکھے ہیں مگر برائیوں پر خونی ماتم جاری ہے۔ سبحان اللہ! فساد کی بیخ کنی کیے بغیر اصلاح کی کوشش ہو رہی ہے۔ جو قوم ذوقِ تکلم، ذوقِ سماعت، طریقِ صبر وتحمل، حسنِ معاشرت، آدابِ مجالست، جمالِ محفل اور نزاکتِ مقام کو فراموش کر چکی ہو اسے مروت، کمالِ مردانگی، اخلاصِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ امورِ حیاتِ زندہ کی انجام دہی کا اس سے کیا مطالبہ؟ جہاں حسنِ مروت مفقود وہاں حفظِ سنت معدوم۔ یہ صرف ایک قوم کا المیہ نہیں بلکہ اقوامِ عالم کے احوال بھی یہی ہیں۔ اور اگر یہی کچھ جاری رہا تو اکیسویں صدی میں مقاماتِ ہلاکت کی تکثیر ہوتی جائے گی اور اس مذمومیت کا سیاہ سہرا سب سے بڑھ کر قیادت کے سر ہوگا۔ اس وجہ سے اکیسویں صدی کی قیادت کو جمہوریت وآمریت اور ان

سے متعلقہ سیاسی، معاشرتی، معاشی، قومی اور بین الاقوامی تصوراتِ مکذوبہ کو خیر باد کہہ کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا ہوگی جس میں فرد وقوم کی آزادی کا تحفظ اس قرینے سے ہو کہ حسنِ سلیقہ کی حامل مثبت اقدار ہر سطح پر ہمارے ظاہری اور باطنی معاملات اور کاروبار کا حصہ بنیں، اور ہماری تہذیب وتمدن انہیں کی آئینہ دار ہو۔ صرف اسی صورت میں قومی و بین الاقوامی سطح پر فلاحی معاشرہ، فلاحی ریاست اور انسانی تہذیب وتمدن کا قیام ممکن ہے۔ اس ضمن میں خصوصاً مغرب کی پراگندہ اور آلودہ فضا میں، جو دوسرے، خصوصاً مسلم، معاشروں میں بھی تیزی سے سرایت کرتی جارہی ہے، آزادی اور حقوقِ انسانی کے باب میں مروجہ جاہلانہ تصورات میں ترامیم کرکے افراط وتفریط کو دور کرنا ہوگا۔ آزادی کا یہ تصور انتہائی غیر انسانی ہے کہ اخلاقی ضوابط اور معاشرتی آداب کو پسِ پشت ڈال کر انسان جو چاہے کرے؛ اور پھر اس سے بھی آگے غیر انسانی رویہ یہ ہے کہ اگر کثرت کسی برائی پر اتفاق کرلے تو اسی برائی کے ارتکاب کو انسانی حق قرار دے کر قانونی طور پر تحفظ مہیا کردیا جائے۔ بعض مغربی معاشروں میں لواط وسحاق کی قانونی اجازت، پورے مغرب میں جوڑے کی رضامندی پر زناکاری کی اباحت، ویلنٹائن ڈے (Valentine Day) کی بے حیائیاں، اور اس طرح کے دیگر غیر انسانی اور تحت الحیوانی رویے اس افراط وتفریط کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان تحت الحیوانی رویوں کی بنا پر معاشرتی، مذہبی، سیاسی اور جنسی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر جو اندھے تعصبات ذہنی وفکری اعتبار سے تشکیل پاتے ہیں ان کا اظہار کبھی کمزور ممالک پر مختلف بہانوں سے استحصالی معاشی پابندیوں کے روپ میں ہوتا ہے، کبھی کسی ملک پر خالصتاً نفسانی اغراض کے تحت ارہابی یورشوں کی شکل میں، کبھی مسلم بچیوں کے سکارف پہننے پر پابندی اور غیر ملکیوں خصوصاً مسلمانوں پر قومی و بین الاقوامی معاشرے میں گوناگوں پابندیوں کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی اس تنگ نظری پر منتج ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی دیگر ممالک کو منتقل نہ کی جائے۔ خود ہر قسم کا مہلک جوہری

اور کیمیاوی اسلحہ ہمیشہ تیار رکھا جائے مگر جب کوئی دوسرا وہی اسلحہ بنائے تو متنوع پابندیاں عائد کر کے، دباؤ ڈال کر، حتیٰ کہ ہلاکت آمیز ارہابی حملے کر کے، اسے نہ صرف روکا جائے بلکہ اس کی تمام معاشرتی، سیاسی وقومی اور انتظامی مشینری کو کچل دیا جائے تا کہ اپنی دہشت انگیز فوقیت اور سیطرت کو برقرار اور دوسری اقوام کو ہمیشہ کمزور و مغلوب رکھا جائے۔ دیگر اقوام پر عدم صبر و تحمل کے فتوے، ارہابیت کے الزامات، بے صبری کے طعنے اور اس پر ننگِ انسانیت تادیبی کاروائیاں! جب کہ خود اپنا عالم یہ کہ پہلا ایٹمی بم گرانے اور دفترِ ہلاکت کھولنے کا سہرا اپنے سر؛ ہر تباہ کن سازش بھی اپنا شعار اور امن و آشتی کے اپنی زبانی نقیب بھی؛ ارہابیت و انسانیت سوزی اپنا وطیرہ اور حقوق انسانی کے تحفظ کے مکارانہ دعوے بھی!! کوئی ایک بات ہو تو گنی جائے، کوئی ایک ہلاکت ہو تو شمار ہو! حسنِ اخلاق و آداب کی پامالی سے جو خونی قلزم بچھے ان کی گیرائی اور گہرائی کی پیمائش کے لئے طویل مدت درکار ہے۔ مغرب نے افرادِ انسانیت پر جلتے جہنم کے منہ براہِ راست دنیا میں بھی کھول دیئے اور عقبیٰ میں بھی۔ اکیسویں صدی کی قیادت کو حسنِ توجہ سے حسنِ اخلاق و آداب کی ترویج کرنا ہوگی تا کہ دنیا امن کا گہوارہ ہو، اور عقبیٰ کیلئے سلامتی کی راہ کھلے۔ اور یہ کارنامہ صرف امتِ مسلمہ کی قیادت ہی انجام دے سکتی ہے: اسی کی ذمہ داری اور فرض ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو دوسری امتوں پر ہمیشہ کے لیے نگران قرار دے کر [49] یہ واضح فرمادیا کہ قیادت کی صلاحیت و اہلیت صرف اور صرف امتِ مسلمہ کو عطا کی گئی ہے، لہٰذا اس پر صرف اُسی کا حق ہے۔ دیگر اقوام اس اہلیت و حق سے عاری ہیں اور اسی بات پر پوری انسانی تاریخ شاہدِ عادل ہے۔

اس حق کی تحصیل و تعمیل اور برقراری کیلئے ضروری ہے کہ حسنِ اخلاق و آداب کے زرّیں اور عملی نظامِ اسلام کی بدرجۂ احسان متابعت کی جائے اس احسان طالب محرکانہ متابعت کے لیے امامِ طریقت سیدنا علی ہجویری رضی اللہ عنہ نے چند بنیادی اصولوں کی

توضیح عقلی و شرعی سطح پر کی ہے۔ جنہیں اپنانے سے اس نظامِ اخلاق و آداب کی حسبِ منصب بارآوری ہوگی۔ ان میں سے چند ایک کا بیان خالی از فائدہ نہ ہوگا:

## پہلا اصول:

جس پر تقریباً پوری **کشف المحجوب** میں بار بار زور دیا گیا ہے، **حقیقت پسندی** ہے۔ اور اکیسویں صدی کا خصوصی تقاضا ہے۔ اس اصول کی وضاحت نہایت لطیف انداز میں حدیثِ رسول علیہ الصلاۃ والسلام: ★كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَه★ ''جسے جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہوتا ہے اُسے اُسکی توفیق عطا کردی جاتی ہے'' کے حوالے سے کی گئی ہے۔ پھر حجابِ رینی اور حجابِ غینی کی تشریح میں یہ بات واضح کردی گئی کہ حجابِ غینی کا دور ہونا ممکن ہے اور یہ صرف مسلمان سے مخصوص ہے؛ جبکہ حجابِ رینی ذاتی ہے، اور صرف غیر مسلم کے لئے مخصوص ہے۔ لہٰذا امورِ حیات کی تدبیر میں توفیق اسی خصوص کے مطابق حاصل ہوگی۔ جب تک اس حقیقت کی شناخت نہ ہوگی مقاصدِ شریعت حاصل نہ ہونگے۔ [50]

## دوسرا اصول:

یہ ہے کہ **تحقیق و عملِ پیہم** کو شعار بنایا جائے نہ کہ تقلیدِ محض کو؛ تصوف رسم نہیں بلکہ عمل ہے۔ لہٰذا صوفیائے کرام کی عبارات کو پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ ان کے اندر موجود اصل معنی کو اپنانے سے تحقیق تک رسائی ہوگی اور مقاصدِ شریعت کا حصول ہو گا۔ [51]

## تیسرا اصول:

یہ ہے کہ تحقیق و عملِ پیہم کا عنقا اس وقت تک ہمارے ہاتھ نہ لگے گا جب تک ہمارا ظاہر و باطن ہم آہنگ نہ ہوگا۔ **ظاہر و باطن میں یگانگت**، مروت یعنی انسانیت و مردانگی کا اوّلین تقاضا ہے۔ اور صوفی چونکہ مردِ کامل ہی نہیں بلکہ دوسروں کو درجۂ کاملیت

تک پہنچانے والا ہوتا ہے؛ کیونکہ معلمِ لطیف اور مبلغِ بلیغ ہے؛ اسلئے اسکے لئے یہ یگانگت شرطِ اوّل ہے[52] کیونکہ اس کے بغیر منتہائے شریعت...... معرفتِ حق اور مشاہدہ..... حاصل نہیں ہوتا۔ اور مشاہدۂ حق کے بغیر حقیقتِ ظاہرہ مفتوح نہیں ہوتی۔ لہٰذا صوفی اس استقامت سے مشاہدِ حق ہوتا ہے کہ احوالِ دنیوی اسے اللہ سے نہیں پھیرتے۔ اور یہ مقامِ جمع ہے۔[53] اسی حقیقت کے پیشِ نظر داتا حضور رضی اللہ عنہ بار بار مترسّمین (جعلی نام نہاد صوفیوں) کو نشانۂ تنقید بناتے ہیں۔ کیونکہ صوفی کا کام تزکیۂ نفس اور نیابتِ رسول ﷺ کو بطریقِ احسان نبھانا ہے، اور اس طرح سے وہ افراد تیار کرنا ہے جو معاشرتی وسماجی اور قومی و بین الاقوامی سطح پر مقاصدِ شریعت کی تعمیل اور عملی نفاذ کرتے ہیں۔ جو لوگ حرص وآز کے بُت سینوں میں چھپائے ہوئے تصوف کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں وہ خود بھی گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ رسوم کے پابند اور اخلاق سے مفرور ہوتے ہیں۔

اس مقام پر مناسب نظر آتا ہے کہ داتا حضور رضی اللہ عنہ نے رسوم و اخلاق میں جو فرق کیا ہے اسے بیان کر دیا جائے۔ ''رسوم'' یہ ہے کہ بندہ کسی فعل کو اسباب وتکلف سے یوں انجام دے کہ اسکا ظاہر اسکے باطن کے خلاف ہو۔ ایسا فعل معنی سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ''اخلاق'' اس پسندیدہ فعل کا نام ہے جو بلا تکلف و اسباب اس طرح سے انجام پائے کہ بندے کا ظاہر مکمل طور پر باطن سے ہم آہنگ ومتحد ہو، اور دعویٰ سے خالی ہو۔[54] اور ظاہر و باطن کا یہی اتحاد و یگانگت ''استقامت مع اللہ'' کا ضامن ہے۔[55] جعلی صوفی چونکہ محض پابندِ رسوم ہوتا ہے نا اہل، منافق اور کردارِ کردار ساز سے تہی دامن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طریقت کے بنیادی اصول متانت وسنجیدگی کے برعکس اس کے کردار میں ہزل یعنی غیر سنجیدگی کا پہلو غالب رہتا ہے۔ ناچنا گانا اسی غیر سنجیدگی کا دلدوز نتیجہ ہے۔[56]

**کشف المحجوب** کے عام مطالعہ سے ہی یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ مسلم معاشرہ کو بہت بڑا خطرہ انہیں مترسمین یعنی جعلی صوفیوں سے ہے۔ مسلم معاشرہ کو جہاں بہت سے معروضی مسائل درپیش ہیں وہاں داخلی مسائل بھی لاحق ہیں۔ ان داخلی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ ''ترسّم'' ہے۔ اکیسویں صدی کا مسلم فرد و معاشرہ اس برائی سے اگر کماحقہ روشناس نہ ہوا، مقاصدِ شریعت کا حصول ناممکن ہے۔ **کشف المحجوب** اس اعتبار سے بھی آج کی اہم ضرورت ہے کہ اس میں ترسّم کی مذمت بھی کی گئی ہے اور اسکی علامات کی نشاندہی اور تعیین بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اصولِ تصوف اور مبادیِ طریقت کی توضیح و تشریح بھی خوبصورت اور موثر انداز سے کر دی گئی ہے تاکہ ہر دور کا انسان ابدی رہنمائی سے مستفیض ہوتا رہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

**اولاً:-** ولی ہمیشہ شریعت کی متابعت کرتا ہے۔ جو شخص بھی شریعت کی پابندی سے آزاد ہو بے دین وملحد ہے؛[57] حتیٰ کہ کسی حال کے بہانے سے بھی ترکِ شرع سخت گناہ ہے۔ مترسمین اور حلولیوں کی مزمت کرتے ہوئے داتا حضور رضی اللہ عنہ اس اہم عرفانی اصول کی وضاحت سیدِ کائنات ﷺ کی ایک حدیثِ پاک سے کرتے ہیں جس میں حضور عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ نے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے کو تہمت آور مقامات پر قیام سے منع فرمایا ہے۔[58]

**ثانیاً:-** معرفتِ الٰہیہ جو کہ منتہائے شریعت ہے ''حیاتِ دل'' ہے۔ اور دل کی زندگی اس میں ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی میں نہ لگے۔ ہر انسان کی قیمت کا تعین بقدرِ معرفتِ الٰہیہ ہوتا ہے۔ معرفت اللہ تعالیٰ کے بارے میں صرف درست علم کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ''صحتِ حال'' کو کہتے ہیں۔ لہٰذا عارف کبھی بھی بے علم

نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ عالم عارف نہ ہو۔[59]

**ثالثاً:۔** صوفیائے کرام کا اونی لباس ہر دور کے انسان کیلئے اگر چہ نفسیاتی طور پر باعثِ اطمینان، طبی اعتبار سے صحت مندی کا ضامن، انسانی مساوات کے تصور کو اجاگر کرنے والا اور معاشرتی ہمواری کا درس دہندہ ہے مگر یہ صوفیائے کرام کی پہچان نہیں ہے۔[60] داتا حضور رضی اللہ عنہ اپنے مخصوص انداز میں یہاں پر بھی بدرجۂ کمال عملیت پسند واقع ہوئے ہیں۔

**رابعاً:۔** عملی طریقِ حیات کو اپناتے ہوئے حضرت امام علی ہجویری رضی اللہ عنہ غیر مستقیم (مجذوب وغیرہ) کی اقتداء سے منع فرماتے ہیں[61] اور صرف صحو کے قائل ہیں؛ اور اگر اہلِ سکر سے کسی انداز میں اتفاق کرتے بھی ہیں تو صحو کی سطح سے[62] **کشف المحجوب** میں صحو و سکر سے متعلق دی گئیں وضاحتوں کی آج شدید ضرورت ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشروں میں بہتیرے مجذوب ہیں اور بہتیرے پکھنڈ باز مجذوب بنے بیٹھے ہیں اور ان کے گرد عوام دائرے جمائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ مجذوب اگر چہ ولی ہوتا ہے مگر لائقِ متابعت نہیں ہوتا۔ جبکہ پکھنڈ باز مجذوب محض دھوکہ باز اور ہوا و ہوس کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لئے گمراہیوں کا باعث بنتے ہیں۔

**خامساً:۔** ہر شخص میں خرقہ پوشی کی صلاحیت و اہلیت نہیں ہے۔ آج کے مسلم معاشرے میں ایک قبیح رسم چل نکلی ہے کہ خرقۂ خلافت ایسے نااہلوں کو پہنایا جاتا ہے جنہیں کثرتِ مال و زر، وفرتِ عز و جاہ یا قربتِ شیخ حاصل ہوتی ہے۔ ذوقِ ریاضت سے آشنائی نہ حسنِ اخلاق و آدابِ کریمہ سے شناسائی؛ باطنِ ظاہر افروز نہ ظاہرِ باطن آمیز۔ شیوخ اور پیروں کا یہ عالم کہ اپنی خبر نہ مرید کا پتہ؛ کردارِ کردار ساز نہ شخصیتِ شخصیت ساز۔ ایسے پیر سے مرید کو، اور ایسے مرید

سے پیر کو سوائے گمراہی کے اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ ایک رستا ہوا ناسور ہے۔ مسندِ تبلیغ وارشاد سجادۂ غرور و تمکین نہیں ہوتی بلکہ خدمتِ خلق، تزکیۂ نفس، تعمیر کردارِ فعاّل، تربیتِ اخلاق وآدابِ کریمہ اور تحریکِ نفوسِ قدسیہ کی آماجگاہ ہوتی ہے، جو ایسے افراد تیار کرتی ہے جو ہر سطح پر مقاصدِ شریعتِ اسلامیہ کے حصول میں مستغرق رہتے ہیں۔ اور سلطانِ ملت کو حقیقی معنوں میں یقینی بناتے ہیں۔ مگر آج ہماری اکثر خانقاہوں میں نااہل سجادہ نشین براجمان ہیں۔ اور عوام طرح طرح سے ان کی حرص وآز اور ہوا و ہوس کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے معاشرہ اپنی ہر سطح پر پراگندگی، جہالت، بے دینی، تعصب اور تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا ہے۔ اکیسویں صدی کی تحدّیات (Challenges) کا مقابلہ کرنے کے لئے تطہیرِ خانقاہ ایک بنیادی اور اہم ترین بات ہے۔ **کشف المحجوب** اس باب میں بھی ہمیں بہترین عملی رہنمائی مہیا کرتی ہے۔ خرقہ پوشی کے لئے جسے شرطِ اولین قرار دیا گیا وہ خدمتِ خلق ہے۔ خدمتِ خلق کو آدابِ کریمہ شمار کیا گیا۔ اور شیخِ طریقت پر فرض کیا گیا کہ وہ مرید کو تین سطحوں پر خدمت کروائے:

۱) پہلا سال مرید خدمتِ خلق میں بسر کرے۔ اور وہ اس طرح سے کہ خود کو خادم اور باقی تمام مخلوق کو مخدوم کا درجہ دے۔ بلا امتیاز ہر ایک کی خدمت کرے۔ ہر ایک کو خود سے بہتر گردانے اور اس خدمت کی وجہ سے دوسروں پر اپنی برتری نہ جتلائے۔

۲) دوسرا سال ''خدمتِ حق'' میں گزارے۔ وہ اس انداز میں کہ فکرِ دنیا و آخرت سے آزاد ہو کر اللہ کی عبادت صرف اللہ ہی کیلئے کرے۔

۳) تیسرا سال اپنے دل کی نگرانی میں کاٹے۔ وہ یوں کہ اپنی تمام تر ہمت کو اس خوش اسلوبی سے جمع کرے کہ دل گونا گوں غموں سے پاک ہو جائے اور انسِ الٰہی کی بارگاہ میں غفلت سے محفوظ ہو جائے۔

مرید جب ان تینوں شرائط کو پورا کرلے تو وہ خرقۂ ولایت پہننے کا اہل ہوگا۔ لیکن ہر شیخ خرقۂ خلافت نہیں پہنا سکتا۔ بلکہ شیخِ خرقہ پوشان کے لئے ضروری ہے کہ:

الف) مستقیم الحال ہو۔ یعنی طریقت کے تمام نشیب وفراز سے گذر چکا ہو، ذوقِ احوال کو چکھ اور مشربِ اعمال کو پا چکا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے غلبۂ جلال اور لطفِ جمال کا تجربہ رکھتا ہو۔

ب) مرید کے احوال کا نگران ہو، اور جانتا ہو کہ وہ طریقت ومعرفت میں کس انتہا کو پہنچے گا۔ اگر مرید لوٹنے والا ہو تو اُسے طریقت میں چلنے سے منع کر دے، اور اگر مراد کو پہنچ سکتا ہو تو اس کی تربیت کرے کیونکہ شیخ دلوں کا طبیب ہوتا ہے۔ لہٰذا مرید کی بصیرت کے مطابق اسے دعوت دی جائے گی۔

ج) یہ جانتا ہو کہ مسندِ تبلیغ وارشاد پر متمکن ہونے والا بہر رنگ حرص وآز اور ہوا وہوس سے پاک ہو۔

د) طریقت میں اس قوت کا حامل ہو کہ اگر شریعت ومعرفت سے ناواقف پر نگاہ ڈالے تو اسے واقف کر دے اور اگر کسی گنہگار کو خرقۂ ولایت پہنا دے تو اسے ولی بنا دے۔

جو شیخ مذکورہ بالا شرائط پر پورا اترتا ہو وہ خرقہ پوشانی کا اہل ہوگا ورنہ نہیں۔[63] اور اپنی اسی اہلیت وسیطرت کی بدولت وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں ہر درجہ ومقام فانی ہو جاتا ہے، الفاظ اسے بیان کرنے سے عاجز اور عبارات ناکارہ۔ ایسے میں اسے کوئی صوفی کہہ کر پکارے یا کچھ اور؛ وہ ہر ایک سے ماورا ہوتا ہے۔[64] اخلاق وآدابِ علیا کی اس انتہا پر

پہنچ کر ولی اللہ حقیقی تصوف کا الہیاتی نمائندہ اور منتہائے شریعت کو پالینے والا اور اس کا ترجمانِ اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داتا حضور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک معانیِ تصوف کا انکار ساری شریعتِ رسول علیہِ الصَّلاۃ والسَّلام کا انکار ہے۔ اور شریعت قرآن وسنت پر مبنی ہے جو کہ ہمہ گیر اور عین فطرت ہے۔

## چوتھا اصول:

**ایشار** ہے۔ ایثار کے بغیر معاملاتِ حیات کی بطریقِ احسان انجام دہی اور اخلاق وآدابِ سنیہ پر عمل پیرا ہونا انتہائی دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ نے ایثار کو بڑی شرح و بسط سے بیان اور اسے طریقت کی اصل قرار دیا ہے۔[65] اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے مصاحب اور ساتھی کی غرض سے اپنے کسی حق سے دستبردار ہونا اور اسکی ضرورت پوری کرنا اکیسویں صدی میں انسان کی اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ ایشار فراخدلی اور قربانی کا متقاضی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ جذبہ اقوامِ عالم میں بیدار نہیں ہوگا۔ ٹیکنالوجی اور دیگر علوم وفنونِ نافعہ کی بہم دیگر منتقلی محال ہے۔

## پانچواں اصول:

**رضا** ہے۔ اور یہ وہ اصول ہے جو اخلاق وآدابِ شریعت کی جان اور روحِ رواں ہے۔ رضا کی دو قسمیں ہیں:

۱) **بندے سے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا۔** وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ثواب، نعمت اور کرامت عطا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔

۲) **اللہ تعالیٰ سے بندے کا راضی ہونا۔** وہ یہ کہ بندہ فرامینِ الٰہی کو استقامت سے بجالاتا ہے اور اس کے احکام کی تہہِ دل سے تسلیم کرتے ہوئے تعمیل کرتا ہے۔

داتا حضور رضی اللہ عنہ نے ''رضا'' پر بہت شرح و بسط سے تحریر فرمایا ہے[66]

جس کا مطالعہ انسانِ نو کیلئے بغایت بصیرت افروز ہے۔ مگر کوئی کم کوش و کم ہمت منفی پہلو سے اس گمان میں نہ پڑے کہ ''بیٹھے رہو جو ہوتا ہے ہو'' کیونکہ ایسا گمان شدید غلطی اور سخت ذہنی خلجان کا نتیجہ ہوگا۔ اولیائے کرام کی کتبِ مبارکہ قرآن وسنت کی شارح، اسی قرینے پر مبنی اور جمع کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے مطالعہ کا احسن طریقہ یہ ہے کہ کتاب کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے کے پس منظر و پیش منظر اور بیک دیگر ملابست و تناظر میں پڑھا جائے۔ اس نہج پر جب ''رضا'' کا مطالعہ داتا حضور رضی اللہ عنہ کی طرف سے متابعتِ شریعت پر تاکید، اور ''ناکردہ اولیٰ تراز کردہ'' کہنے والوں کی تردید و مذمت اور اس ضمن میں جدوجہدِ بندہ کے اثبات [67] اور غیبت وحضور کی واضح عین اسلامی شریعت کے مطابق عملی تفسیر [68] کے وسیع تر تناظر میں کیا جائے گا تو منکشف ہوگا کہ ''رضا'' بغایت عملی، قوی، جاندار، فعال اور رجائیت پسندانہ فلسفۂ حیات ہے۔

ان پانچ بنیادی اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر جب حسنِ اخلاق اور آدابِ کریمہ پر مبنی روشن نظامِ اسلام کو اپنایا جائے گا تو مقاصدِ شریعت بدرجۂ احسان حاصل ہونگے اور دینِ متین کا سلطان یقینی ہوگا۔ اور **کشف المحجوب** میں اس نظام کو بہترین اسلوب اور اکمل قرینے سے بیان کیا گیا ہے۔

الغرض عملیت پسندی اور حقیقت نگاہی **کشف المحجوب** کا خاص انداز ہے۔ یہاں تک کہ اصطلاحاتِ تصوف کی تشریح وتوضیح میں بھی عملی شرعی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اور دیانتداری اور اخلاص سے کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ تشعیب جمع کے زیرِ فرمان اس انداز سے ہو جائے کہ قومی و بین الاقوامی سطح پر ایک فلاحی معاشرہ معرضِ وجود میں آجائے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی انتہائی ضرورت اکیسویں صدی میں خون میں نہائی، دم توڑتی ہوئی، مظلوم انسانیت کو ہے۔

# حوالہ جات


[1] القرآن: المائدہ:3

[2] ایضاً: سبا:28

[3] ایضاً: الانبیاء:107

[4] ایضاً: انعام:59

[5] ایضاً: التوبہ:33

[6] عین الفقر: حق باہو قدس سرہ: ص ۹۲، انجمن غوثیہ عزیزیہ حق باہو، دربار عالیہ سخی سلطان باہو، جھنگ۔

[7] القرآن: مثلاً: النجم: آیات ۱ تا ۱۸، الانفال: ۱۷، الفتح: ۱۰، الرحمن: ۱ تا ۴ وغیرھا۔

[8] ایضاً: الانبیاء:7

[9] استرغیب والترہیب: جلد اول، ص ۲۰، دارالکتب العلمیہ، بیروت: الطبعہ :۱۹۹۶۔

[10] احیاء العلوم: الغزالی: جلد اول، ص ۱۱، الدار البیضاء

[11] ایضاً

[12] ایضاً: جلد اول، ص ۱۲

[13] سر الاسرار، ص: ۷۸، غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی علیہ السلام، غوثیہ کتب خانہ، لاہور، ۱۴۱۸ھ

[14] القرآن: یونس:62

[15] ایضاً: آل عمران:104

[16] ایضاً: البقرۃ:151

[17] **Confessions of A British Spy: M. Saddik Gumus, Published by Raza Academy, 16,Carmichael Street, Edgeley, England.**

[18] (ا) الرسالۃ القشیریہ: ص ۳۰۶، الامام القشیری: داراحیاء التراث العربی۔ بیروت ۱۹۹۸ء

(ب) جامع الترمذی: ص ۷۰۶، دارالسلام للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعۃ الاولی ۱۹۹۹ء

[19] کلیاتِ اقبال (اردو): شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔

[20] **Preparing For The Twenty First Century: Paul Kennedy; Random house, New York, 1993. p.11**

[21] **Ibid., pp. 12-16**

[22] **Ibid., pp.41, 43, 44**

[23] **Ibid., pp. 73, 74**

[24] Ibid., p.53

[25] The Clash of Civilisations:Samuel P. Huntington; Touchstone,Rockefeller Center, New Yark,NY 10020

[26] Preparing For The Twenty-First Century: Paul Kennedy, p. 339.

[27] (ا) البخاری، کتاب الایمان: ص ۱۲، دارالسلام للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعۃ الثانیہ، ۱۹۹۹ء
(ب) المسلم: کتاب الایمان: ص ۲۵، دارالسلام للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعۃ الاولی: ۱۹۹۸ء

[28] القرآن: الذاریات:56

[29] کشف المحجوب: ص ۱۳، ۱۴، حضرت امام ابوالحسن علی بن عثمان جُلابی ہجویری غزنوی المعروف داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ۔ انتشاراتِ مرکزِ تحقیقاتِ فارسی، ایران و پاکستان، اسلام آباد ۱۹۹۵ء۔

[30] فرہنگِ عمید: جلد اول، موسسہ انتشاراتِ امیر کبیر، تہران ۱۳۷۹ء

[31] ایضاً: جلد دوم

[32] کشف المحجوب: ص ۱۷، {''کشف المحجوب'' سے دیئے گئے یا دیئے جانے والے تمام حوالہ جات اس کتاب کی مذکورہ قبل اشاعت سے ہیں}

[33] ایضاً: ص 13

[34] ایضاً: ص 14

[35] ایضاً: ص 288

[36] ایضاً: ص 3

[37] ایضاً: ص 3

[38] ایضاً: ص 289-290

[39] ایضاً: ص 288

[40] ایضاً: ص 292-293

[41] ایضاً: ص 306

[42] ایضاً: ص 307

[43] ایضاً: ص 37

[44] ایضاً: ص 49

[45] ایضاً: ص 52

[46] ایضاً: ص 53

[47] ایضاً: ص 487

[48] ایضاً: ص 484-485

[49] القرآن: (۱) الاحزاب:۴۵، (۲) الفتح:۸، (۳) البقرہ:۱۴۳

[50] کشف المحجوب:ص:3-5

[51] ایضاً:ص 8-9

[52] ایضاً:ص 49

[53] ایضاً:ص 51-52

[54] ایضاً:ص 52

[55] ایضاً:ص 52

[56] ایضاً:ص 53

[57] ایضاً:ص 32

[58] ایضاً:ص 265-267

[59] ایضاً:ص 387

[60] ایضاً:ص 58

[61] ایضاً:ص 269

[62] ایضاً:ص 273-275

[63] ایضاً:ص 64-68

[64] ایضاً:ص 70

[65] ایضاً:ص 285

[66] ایضاً:ص 2-263

[67] ایضاً:ص 375-376

[68] ایضاً:ص 345
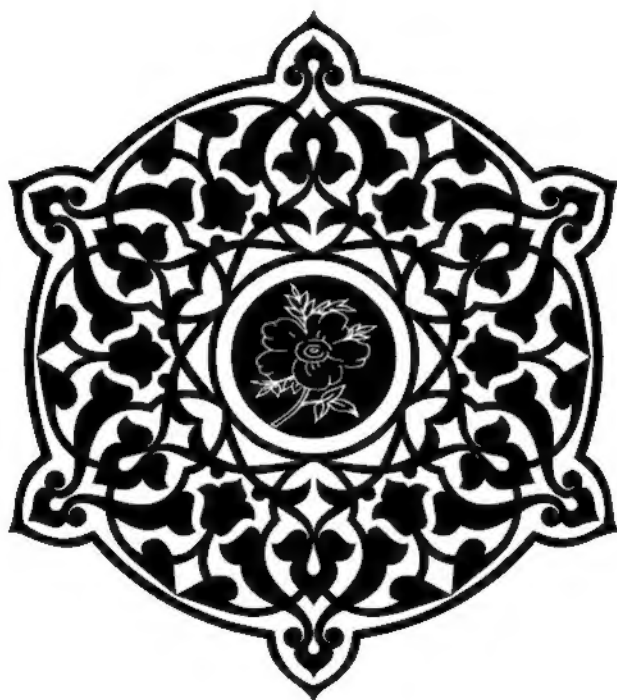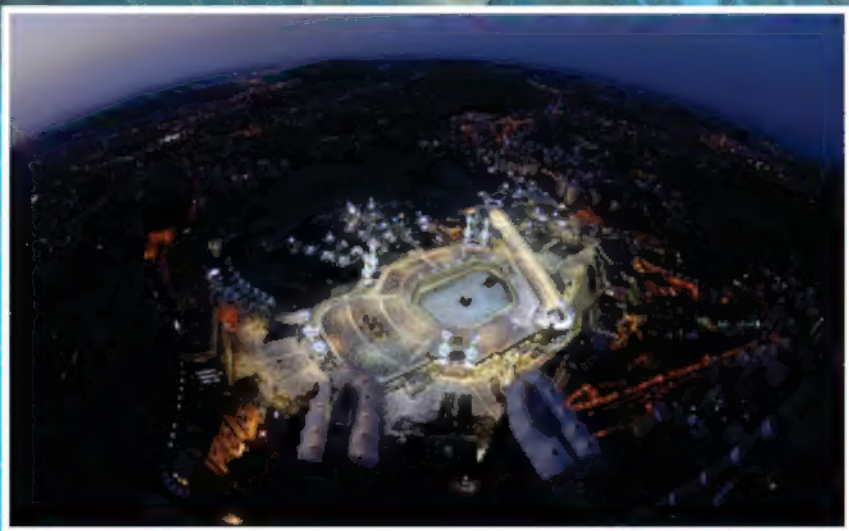
## پبلشر

جیلانی اینڈ کمپنی

زیر مسلم مسجد بیرون لوہاری گیٹ لاہور

موبائل نمبر: 0324-4007011

www.facebook.com/quadirey